تدبّر لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن: خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20x30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

تدبر حدیث

(جلد اول)

شرح مؤطا امام مالکؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ

(کتاب الزکوۃ، البیوع، الاقضیہ، الحدود، الاشربہ، العقول، الجامع، وغیرہ کے منتخب ابواب)

- ترتیب و تدوین خالد مسعود/سعید احمد
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- مالکی فقہ کی آراء کا محاکمہ
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20x30/8 صفحات 544
- قیمت: 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ سمن آباد لاہور

تدبّر لاھور

جاری کردہ

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

شمارہ 73

ستمبر 2001ء

رجب 1422ھ

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)

محبوب سُبحانی

سعید احمد

سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے

سالانہ 50.00 روپے

بیرون ملک 250.00 روپے

(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

مولانا اصلاحیؒ پر رسالہ محدث کا ناروا حملہ 2

خالد مسعود

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری 3

امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی

روزے کے احکام 12

امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی

مقالات

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آغاز/خالد مسعود 27

شفاعت کا صحیح اور غلط تصور/محبوب سبحانی 39

نقد و تبصرہ

اہل "محدث" کے نام/منظور الحسن 47

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہو

مولانا اصلاحیؒ پر رسالہ محدث کا ناروا حملہ

خالد مسعود

مسلک اہل حدیث کے ترجمان رسالہ محدث کی اشاعت اگست ۲۰۰۱ء میں مولانا امین احسن اصلاحی کے فکر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کسی بھی فکر پر نقد و تبصرہ کا ہر کسی کو حق حاصل ہے لیکن اس میں یہ بات بطور خاص ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ انداز وہی اختیار کیا جائے جو علمی مسائل پر گفتگو کے لیے معروف ہے۔ اس کے برعکس محدث نے تعصب میں معیار اخلاق سے گرا ہوا عامیانہ انداز اختیار کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آخرت میں لوگوں کے حسن عاقبت یا سوء عاقبت کا فیصلہ بھی انہوں نے کرنا ہے، اور ان کا یہ فیصلہ ان کے طرز کلام سے ابلا پڑتا ہے۔

قارئین تدبر مولانا اصلاحیؒ کے حدیث کے بارے میں نقطۂ نظر سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ قرآن مجید کو ہر چیز پر، حتی کہ حدیث پر، حاکم مانتے ہیں کیونکہ قرآن کی نص کے مطابق نبی ﷺ کو قرآن میں سر مو تبدیلی یا اس کی تنسیخ کا حق حاصل نہیں تھا۔ اس کے برعکس اہل حدیث بھائیوں کا موقف یہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ مولانا اصلاحیؒ سنت اور حدیث میں فرق کرتے ہیں۔ سنت کو وہ شارع کا بتایا ہوا وہ طریقہ قرار دیتے ہیں جس کو امت کے لیے منہاج قرار دیا تھا۔ یہ طریقہ امت کی دینی زندگی کا جزو بنا دیا گیا اور وہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ لہٰذا جس طرح قرآن قولی تواتر سے منتقل ہوا اسی طرح سنت عملی تواتر سے منتقل ہوئی۔ اس کے برعکس معدودے چند احادیث تواتر سے ہم تک پہنچی ہیں۔ زیادہ تر ذخیرہ اخبار احاد پر مشتمل ہے۔ اہل حدیث کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سنت اور حدیث بالکل مترادف ہیں اور سنت کے جاننے کا ذریعہ حدیث ہی ہے۔ مولانا اصلاحیؒ قرآن کو قطعی الدلالۃ مانتے ہیں، جیسا کہ فی الواقع کلام اللہ کو ہونا چاہیے۔ اہل حدیث کے ہاں قرآن کی یہ حیثیت نہیں۔ مولانا اصلاحی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ائمہ رجال نے سند پر جو کام کر دیا ہے وہ ہمارے لیے کفایت کرتا ہے، لیکن محض مضبوط سند روایت کی صحت کو ثابت نہیں کرتی۔ اس کے لیے روایت کے مضمون پر غور کرنا اور قرآن کے ساتھ اس کی مطابقت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اہل حدیث صحت سند کو روایت کی صحت کے ثبوت کے لیے کافی سمجھتے ہیں (لیکن اس کا حال تدبر کے اسی شمارہ میں صحیح بخاری کی روایات پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا۔ مولانا نے اپنے درس میں ان میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔) مولانا نے اپنے ہر موقف کو مدلل انداز میں لکھا ہے اور اس کے حق میں سلف کے نقطہائے نظر سے بھی دلیلیں فراہم کی ہیں۔ اگر اہل حدیث کا موقف مختلف ہے تو اہل دین کے انہی اختلافات کے بارے میں قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز خود فیصلہ کر کے بتائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔

محدث کے مذکورہ شمارہ پر ایک تبصرہ موقر ماہنامہ اشراق لاہور کی اکتوبر ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ ہم اس کے وہ حصے، جو مولانا اصلاحی کے نقطۂ نظر سے متعلق ہیں، ان صفحات میں اشراق کے شکریہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین کو ان سے مسئلہ زیر بحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مولانا امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب الاجارات کی روایات)

باب: الأجِيرِ فِي الْغَزْوِ

باب: جہاد میں مزدور لے جانے کے بارے میں

✿ حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عُلَيَّةَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَطَاءٌ، عَنْ صَفْوَانَ بْنِ يَعْلَى، عَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ جَيْشَ الْعُسْرَةِ، فَكَانَ مِنْ أَوْثَقِ أَعْمَالِي فِي نَفْسِي، فَكَانَ لِي أَجِيرٌ، فَقَاتَلَ إِنْسَانًا، فَعَضَّ أَحَدُهُمَا إِصْبَعَ صَاحِبِهِ، فَانْتَزَعَ إِصْبَعَهُ فَأَنْدَرَ ثَنِيَّتَهُ فَسَقَطَتْ، فَانْطَلَقَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَهْدَرَ ثَنِيَّتَهُ، وَقَالَ: أَفَيَدَعُ إِصْبَعَهُ فِي فِيكَ تَقْضَمُهَا. قَالَ: أَحْسِبُهُ قَالَ. كَمَا يَقْضَمُ الْفَحْلُ

قَالَ ابْنُ جُرَيْجٍ: وَحَدَّثَنِي عَبْدُاللّٰهِ بْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ، عَنْ جَدِّهِ، بِمِثْلِ هٰذِهِ الصِّفَةِ: أَنَّ رَجُلًا عَضَّ يَدَ رَجُلٍ فَأَنْدَرَ ثَنِيَّتَهُ، فَأَهْدَرَهَا أَبُوبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ.

ترجمہ: یعلی بن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ غزوہ عسرۃ میں شرکت کی اور میرے دل میں سب سے زیادہ جن اعمال پر اعتماد ہے ان میں سے ایک یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے ساتھ ایک مزدور بھی تھا۔ وہ ایک شخص سے لڑ پڑا تو ان میں سے ایک نے دوسرے کی انگلی کاٹ کھائی۔ اس نے اپنی انگلی کھینچی تو دوسرے کے دو دانت بھی کھینچ لیے جو گر پڑے۔ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان دانتوں کو هدر کر دیا اور فرمایا کہ کیا وہ اپنی انگلی تمہارے منہ میں چھوڑ دیتا کہ تم اس کو چبا جاتے۔ یعلی کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ آپ نے فرمایا جس طریقہ سے اونٹ چبا لیتا ہے۔ عبداللہ بن ابی ملیکہ نے اپنے دادا سے ایسا ہی قصہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کا ہاتھ کاٹا تو اس نے اس کے دو دانت کھینچ لیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دانت کا کچھ بدلا نہ دلوایا۔

وضاحت: جیش العسرۃ، غزوہ تبوک کو کہتے ہیں۔ ایک تو یہ سفر دور کا تھا، دوسرے موسم سخت گرمی کا تھا۔

اس لیے نکلنے میں لوگ فیل بھی ہوئے اس وجہ سے اس کو فاضحہ بھی کہتے ہیں یعنی رسوا کن غزوہ۔

حدر کے معنی ہیں کچھ بدلہ نہ دلوانا یا پاداش میں کچھ سزا نہ دینا۔ روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے انگلی کاٹ کھائی، حضرت یعلی کے مزدور نے یا دوسرے شخص نے۔ روایت کا اصل مضمون تو یہ ہے کہ اس طرح کے حالات میں حدر ہو جائے گا یعنی قصاص نہیں ہوگا۔ فقہی مسئلہ یہ ہوا کہ چونکہ اس آدمی نے اپنے دفاع میں کام کیا اور دوسرے کے دانت پر مصیبت آ گئی تو دوسرے آدمی کو پہلے سے کوئی بدلا نہیں دلایا جائے گا۔ لیکن امام صاحب بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ انہوں نے اس سے یہ فقہی مسئلہ نکالا کہ جہاد میں کوئی شخص اپنے ساتھ مزدور بھی رکھ سکتا ہے، اس لیے کہ یعلی بن امیہ نے مزدور رکھا تھا۔ لیکن آج کے ڈسپلن میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب تو Standing Army ہوتی ہے۔ وہ تنخواہ پاتی ہے، ہر چیز اس کو سرکار سے ملتی ہے تو ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ غنیمت میں حصہ پائیں۔ اس دور میں یہ تھا کہ ایک متعین حصہ غنیمت کا ان کا حق بنتا تھا۔ جب نفیر عام ہوتی تو سب چل پڑتے۔ کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تو لڑائی بھی ایک فن بن چکی ہے۔

اس روایت میں امام صاحب نے ایک دوسری تعلیق بھی دے دی ہے کہ اس طریقہ کے ایک قضیہ میں ایک شخص نے دوسرے کا ہاتھ کاٹ لیا۔ اس نے کھینچا تو کاٹنے والے کے دانت اکھڑ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو حدر کر دیا۔ روایت میں الفاظ ہیں بمثل حذہ الصلعۃ۔ صلعۃ کا لفظ کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اصل میں لفظ قضم ہوگا جو لکھنے میں صلعۃ کے قریب ہے تو دونوں میں تشابہ ہو سکتا ہے۔

باب: مَنِ اسْتَأْجَرَ اَجِیرًا فَبَیَّنَ لَهُ الأَجَلَ وَلَمْ یُبَیِّنِ الْعَمَلَ

لِقَوْلِهِ: "اِنِّی اُرِیدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هَاتَیْنِ". اِلَی قَوْلِهِ. "عَلَی مَا نَقُولُ وَكِیلٌ"." (القصص: ۲۷، ۲۸)

یَأْجُرُ فُلَانًا: یُعْطِیهِ اَجْرًا، وَمِنْهُ فِی التَّعْزِیَةِ: اَجَرَكَ اللّٰهُ.

باب: اس بارے میں کہ ایک شخص کسی کو مزدور رکھے، مدت تو اس کے لیے مقرر کر دے لیکن کام نہ بتائے۔

جیسے کلام اللہ میں ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں" سے لے کر "جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ ضامن ہے" تک۔ یا جر فلانا یعنی وہ فلاں کو مزدوری دیتا ہے اور تعزیت میں کہتے ہیں آجرک اللہ یعنی اللہ تجھ کو اس کا بدلہ دے۔

وضاحت: باب کا عنوان یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اجرت پر مزدور رکھے۔ مدت تو بیان کر دے لیکن کام نہ بتائے تو یہ جائز ہے۔ اس کی تائید میں قرآن سے سورہ قصص کی آیت پیش کی ہے جس میں مدین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام کا حوالہ ہے جب انہیں حضرت شعیبؑ نے یہ پیشکش کی کہ اگر وہ ان کی بکریاں آٹھ سال تک چرائیں تو وہ اپنی ایک بیٹی ان کے نکاح میں دے دیں گے۔ امام صاحب نے باب کے تحت روایت کوئی نہیں دی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ باب میں بیان کردہ مسئلہ امام صاحب کی رائے ہے۔ گویا یہ مسئلہ فقہ کا ہو گیا، بلکہ اگر کہیے تو تفسیر کا ہو گیا کہ اس طرح کا اجارہ جائز ہے۔ یہ مسئلہ حدیث کا نہیں رہا۔ اب آیت پر غور کیجیے تو حضرت شعیبؑ نے جو بات کی ہے وہ ایک ماحول میں خاص قرینہ کے ساتھ کی ہے۔ حضرت موسیٰ نے ان کی بکریوں کو پانی پلانے کا کام کیا ہے۔ پھر ان کو کئی مشکلات درپیش ہیں، خود حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے بیان کیا ہے کہ ہمارے باپ بوڑھے ہیں اور بکریاں ہمیں چرانی پڑتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے واضح ہوتے ہوئے کوئی ابہام تو نہیں تھا کہ ان کو کام نہیں بتایا گیا۔ حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یہ بات بھی ہے کہ یہ نکاح نہیں تھا بلکہ امتزاج تھا۔ معلوم نہیں اور کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔ حضرت شعیبؑ نے بیٹی سے رائے لی ہوگی۔ سب باتیں تو قرآن مجید نے نقل نہیں کی ہیں۔ امام صاحب نے اس کو نکاح مان کر اس سے مسائل نکالے ہیں۔ پس آیت سے مذکورہ استنباط ہے اس لیے کہ ولم یبین العمل والا معاملہ نہ تھا۔ آخر میں امام صاحب نے لفظ 'اجر' کی لغت کی تحقیق بیان کی ہے۔

باب: اِذَا اسْتَأْجَرَ اَجِیرًا عَلَی اَنْ یُقِیمَ حَائِطًا یُرِیدُ اَنْ یَنْقَضَّ جَازَ

باب: ایک شخص اگر مزدور رکھے اس مقصد کے لیے کہ ایک دیوار جو گرا چاہتی ہے اس کو سیدھا کر دے تو ایسا کرنا جائز ہے

وضاحت: اس طریقہ کے کام ہم روز کرتے ہیں۔ ان کے جائز ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ امام صاحب جو بات ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ جز وقتی کام (Part time) کے لیے جس میں وقت کا صحیح تعین نہیں ہو سکتا کسی مزدور کو اجرت پر رکھنا جائز ہے۔ وجہ اس کے ثابت کرنے کی یہ ہے کہ ایسے کاموں کا اس طرح تجزیہ ممکن نہیں ہوتا جس میں نزاع نہ پیدا ہو۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ یہ زمانہ تو گھڑیوں کا ہے جنہوں نے وقت کے تعین کو آسان کر دیا ہے۔ قدیم زمانے میں بھی ظہر کا وقت، عصر کا وقت، قیلولہ کا وقت سب معلوم تھا۔ اپنی تائید میں امام صاحب نے آگے اس تمثیل کو پیش کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت کے لیے یہود کو صبح سے لے کر ظہر تک، نصاریٰ کو ظہر سے عصر تک اور مسلمانوں کو عصر

سے مغرب تک مقرر کیا۔ اس سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ کام جز وقتی بھی ہو سکتا ہے۔

❁ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ مُوسَى أَخْبَرَنَا هِشَامُ بْنُ يُوسُفَ أَنَّ ابْنَ جُرَيْجٍ أَخْبَرَهُمْ قَالَ: أَخْبَرَنِي يَعْلَى بْنُ مُسْلِمٍ، وَعَمْرُو بْنُ دِينَارٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، يَزِيدُ أَحَدُهُمَا عَلَى صَاحِبِهِ، وَغَيْرُهُمَا قَالَ: قَدْ سَمِعْتُهُ يُحَدِّثُهُ عَنْ سَعِيدٍ قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: حَدَّثَنِي أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: فَانْطَلَقَا، فَوَجَدَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ. قَالَ سَعِيدٌ" بِيَدِهِ هٰكَذَا وَرَفَعَ يَدَيْهِ . فَاسْتَقَامَ. قَالَ يَعْلَى: حَسِبْتُ أَنَّ سَعِيدًا قَالَ: فَمَسَحَهُ بِيَدِهِ فَاسْتَقَامَ، قَالَ: لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا قَالَ سَعِيدٌ": أَجْرًا نَأْكُلُهُ

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے ابی بن کعب نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ دونوں (موسیٰ اور خضر) چلے، انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ سعید نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کر کے بتایا کہ خضر نے ہاتھ اٹھائے تو دیوار کھڑی ہو گئی۔ یعلیٰ کا بیان ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ سعید نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چھوا تو وہ کھڑی ہو گئی۔ (موسیٰ نے اس پر کہا کہ) اگر تم چاہتے تو اس کام کی مزدوری لے لیتے۔ سعید کہتے ہیں کہ ان کی مراد اجرت تھی کہ ہم اس کو کھاتے۔

وضاحت: یہاں راویوں کا قضیہ تو یہ ہے کہ سورہ کہف میں بیان ہونے والے واقعہ کو ایک نے دوسرے سے مختلف طور پر سمجھا ہے۔ اس قضیہ کو چھوڑ دیجئے یہاں جو کچھ بیان ہوا ہے حدیث نہیں بلکہ تفسیر ہے۔ اس بارے میں میری رائے آپ تدبر قرآن میں پڑھ لیجئے۔

باب: الإِجَارَةِ إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ
باب: کسی کو دوپہر تک مزدوری پر رکھنا

❁ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ"، عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ أَهْلِ الْكِتَابَيْنِ، كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَأْجَرَ أُجَرَاءَ، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنْ غُدْوَةٍ إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ عَلَى قِيرَاطٍ؟ فَعَمِلَتِ الْيَهُودُ، ثُمَّ قَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلَى صَلَاةِ الْعَصْرِ عَلَى قِيرَاطٍ؟ فَعَمِلَتِ النَّصَارَى، ثُمَّ قَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنَ الْعَصْرِ إِلَى أَنْ تَغِيبَ الشَّمْسُ عَلَى قِيرَاطَيْنِ؟ فَأَنْتُمْ هُمْ، فَغَضِبَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى، فَقَالُوا: مَا لَنَا، أَكْثَرَ عَمَلًا وَأَقَلَّ عَطَاءً؟ قَالَ: هَلْ نَقَصْتُكُمْ مِنْ حَقِّكُمْ؟ قَالُوا: لَا، قَالَ: فَذٰلِكَ فَضْلِي أُوتِيهِ مَنْ أَشَاءُ.

ترجمہ: ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری مثال اور دونوں اہل کتاب کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک شخص نے مزدوری پر مزدور رکھے اور اعلان کیا کہ تم میں سے کون ایک قیراط پر صبح سے لے کر دوپہر تک میرا کام کرے گا تو یہود نے یہ کام کیا۔ پھر اس نے اعلان کیا، تم میں کون ایک قیراط پر دوپہر سے لے کر عصر تک میرا کام کرے گا تو نصاریٰ نے یہ کام کیا۔ پھر اس نے کہا، عصر سے لے کر سورج کے ڈوبنے تک کون میرا کام کرے گا دو قیراط پر تو یہ کام کرنے والے تم لوگ ہو۔ تو یہود و نصاریٰ برہم ہوئے۔ انہوں نے کہا کیا بات ہے کام ہم نے زیادہ کیا اور مزدوری ہماری کم ہے تو اس شخص نے کہا کیا تمہارا کچھ حق میں نے دبا لیا۔ انہوں نے کہا نہیں۔ تب اس نے کہا یہ میرا فضل ہے، میں جس کو چاہوں دوں۔

وضاحت: اگر امام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آدھے دن کے لیے مزدوری پر کسی کو رکھنا جائز ہے تو اس روایت سے یہ بات تو ثابت ہو گی۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کا کہنا غلط ہے کہ دن کی ایسی تقسیم نہیں ہو سکتی جس میں نزاع نہ ہو۔ اس روایت میں تقسیم ہے بلکہ صبح سے لے کر ظہر تک، ظہر سے لے کر عصر تک اور پھر عصر سے لے کر سورج ڈوبنے تک تینوں جز وی حصے ثابت ہوتے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ تمثیل کا کیا مطلب ہے تو میرا خیال ہے کہ یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آگے مزید دو روایتیں آ رہی ہیں۔ پہلی دو روایتوں میں راویوں کی کم فہمی کی وجہ سے بات بالکل گھپلا ہو گئی ہے اور ان پر بہت سارے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح بات تیسری روایت میں واضح ہو جائے گی۔ لہٰذا وضاحت بھی وہیں موزوں ہو گی۔

باب: الإِجَارَةِ إِلَى صَلَاةِ الْعَصْرِ
باب: عصر کی نماز تک مزدور لگانے کے بارے میں

❁ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ"، عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ، مَوْلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: إِنَّمَا مَثَلُكُمْ وَالْيَهُودِ وَالنَّصَارَى، كَرَجُلٍ اسْتَعْمَلَ عُمَّالًا، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ عَلَى قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ الْيَهُودُ عَلَى قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ، ثُمَّ عَمِلَتِ النَّصَارَى عَلَى قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ، ثُمَّ أَنْتُمُ الَّذِينَ تَعْمَلُونَ مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلَى مَغَارِبِ الشَّمْسِ عَلَى قِيرَاطَيْنِ قِيرَاطَيْنِ، فَغَضِبَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى، وَقَالُوا: نَحْنُ أَكْثَرُ عَمَلًا وَأَقَلُّ عَطَاءً؟ قَالَ: هَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِنْ حَقِّكُمْ شَيْئًا؟ قَالُوا: لَا، فَقَالَ: فَذٰلِكَ فَضْلِي أُوتِيهِ مَنْ أَشَاءُ.

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال

ایسی ہے جیسے کہ ایک شخص مزدور رکھے اور کہے کہ دوپہر تک کون میرا کام ایک ایک قیراط پر کرتا ہے۔ تو یہود نے ایک ایک قیراط پر کام کیا۔ ان کے بعد نصاریٰ نے ایک ایک قیراط پر کیا۔ پھر تم لوگ ہو کہ جو نماز عصر سے لے کر سورج غروب ہونے تک دو دو قیراط پر کرو گے۔ تو یہود اور نصاریٰ دونوں برہم ہوئے اور بولے کہ کام تو ہم نے زیادہ کیا اور مزدوری ہم ہی کو کم ملی۔ تو ارشاد ہوگا کہ کیا میں نے تمہارے حق میں کوئی کمی کی ہے تو کہیں گے کہ نہیں۔ ارشاد ہوگا یہ میرا فضل ہے میں جسے چاہوں دوں۔

بَاب: اِثْمِ مَنْ مَنَعَ أَجْرَ الْأَجِيرِ

باب: اس شخص کا گناہ جو مزدور کی مزدوری نہ دے

۞ حَدَّثَنَا يُوسُفُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنِي يَحْيَى بْنُ سُلَيْمٍ، عَنْ إِسْمَاعِيلَ بْنِ أُمَيَّةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ثَلَاثَةٌ " أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ " أَعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ " بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ " اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ہیں جن کا قیامت کے دن میں مخالف ہوں گا۔ ایک تو وہ شخص جس نے میرے ساتھ کوئی عہد و پیمان کیا اور پھر بے وفائی کی۔ دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد کو غلام بنا کر بیچ ڈالا اور اجرت ہڑپ کر ڈالی۔ تیسرا وہ شخص جس نے کوئی مزدور رکھا، کام تو پورا لیا لیکن اجرت نہیں دی۔

وضاحت: یہ حدیث بہت لاجواب اور قیمتی ہے۔ اس پر کسی تقریر کی ضرورت نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا مدعی بنے گا تو مخالف کے لیے نجات پانے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔ تینوں کردار واضح ہیں۔ غلام بنانے کا راستہ اس زمانے میں مسدود ہو گیا لیکن کسی کا حق دبا لینا، زمین، مکان، جائیداد ہڑپ کر لینا سب اس میں شامل ہیں۔

یہ حدیث تو لاکھوں کی ہے، الفاظ بہت پاکیزہ ہیں، بیان بھی پاکیزہ ہے، دل پسند معلوم ہوتی ہے لیکن بے محل ہے۔ شارحین بھی کہتے ہیں کہ اس روایت کا محل سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے بعد وہی اوپر والی حدیث پھر آ رہی ہے صرف ایک قدم کا تو فاصلہ تھا۔ امام صاحب اس باب کو پیچھے کر دیتے اور اگلے باب کو پہلے لے آتے۔ وہ ایسے آدمی تو نہ تھے کہ اتنا بھی امتیاز ان کو نہ ہوتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ روایات کرنے کا موقع تو ان کو ملا لیکن ترتیب و تہذیب کا موقع بالکل نہ ملا اور لوگوں نے غیر مرتب حالت ہی میں کتاب کی روایت شروع کر دی۔

بَاب: الْإِجَارَةِ مِنَ الْعَصْرِ إِلَى اللَّيْلِ

باب: عصر سے لے کر رات تک مزدور لگانا

۞ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ، عَنْ بُرَيْدٍ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَثَلُ الْمُسْلِمِينَ وَالْيَهُودِ وَالنَّصَارَى، كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَأْجَرَ قَوْمًا، يَعْمَلُونَ لَهُ عَمَلًا يَوْمًا إِلَى اللَّيْلِ، عَلَى أَجْرٍ مَعْلُومٍ، فَعَمِلُوا لَهُ إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ، فَقَالُوا: لَا حَاجَةَ لَنَا إِلَى أَجْرِكَ الَّذِي شَرَطْتَ لَنَا، وَمَا عَمِلْنَا بَاطِلٌ "، فَقَالَ لَهُمْ: لَا تَفْعَلُوا، أَكْمِلُوا بَقِيَّةَ عَمَلِكُمْ، وَخُذُوا أَجْرَكُمْ كَامِلًا، فَأَبَوْا وَتَرَكُوا، وَاسْتَأْجَرَ أَجِيرَيْنِ بَعْدَهُمْ، فَقَالَ لَهُمَا: أَكْمِلَا بَقِيَّةَ يَوْمِكُمَا هٰذَا، وَلَكُمَا الَّذِي شَرَطْتُ لَهُمْ مِنَ الْأَجْرِ، فَعَمِلُوا، حَتَّى إِذَا كَانَ حِينُ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَالَا: لَكَ مَا عَمِلْنَا بَاطِلٌ "، وَلَكَ الْأَجْرُ الَّذِي جَعَلْتَ لَنَا فِيهِ. فَقَالَ لَهُمَا: أَكْمِلَا بَقِيَّةَ عَمَلِكُمَا، مَا بَقِيَ مِنَ النَّهَارِ شَيْءٌ " يَسِيرٌ "، فَأَبَيَا، وَاسْتَأْجَرَ قَوْمًا أَنْ يَعْمَلُوا لَهُ بَقِيَّةَ يَوْمِهِمْ، فَعَمِلُوا بَقِيَّةَ يَوْمِهِمْ حَتَّى غَابَتِ الشَّمْسُ، وَاسْتَكْمَلُوا أَجْرَ الْفَرِيقَيْنِ كِلَيْهِمَا، فَذٰلِكَ مَثَلُهُمْ وَمَثَلُ مَا قَبِلُوا مِنْ هٰذَا النُّورِ.

ترجمہ: ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں، یہود اور نصاریٰ کی تمثیل یوں ہے جیسے کہ ایک شخص نے ایک قوم کو اجرت پر رکھا کہ وہ پورے دن کا کام رات تک ایک معین اجر پر کریں گے تو انہوں نے نصف دن تک کام کیا۔ پھر بولے کہ جو مزدوری آپ نے ٹھہرائی تھی ہم کو نہیں چاہیے اور جو کچھ ہم نے عمل کیا وہ سب باطل۔ تو اس نے کہا ایسا نہ کرو اپنا باقی کام پورا کرو اور اپنی مزدوری پوری لو تو انہوں نے نہ مانا اور کام چھوڑ گئے۔ تو اس شخص نے دو ملازم ان کے بعد رکھے اور ان سے کہا کہ بقیہ کام باقی دن میں پورا کرو اور تمہارے لیے اجر وہ ہے جس کا میں نے پہلوں سے وعدہ کیا تھا۔ تو انہوں نے کام کیا یہاں تک کہ نماز عصر کا وقت آ گیا تو ان دونوں نے کہا اب تک ہم نے جو کام کیا ہے وہ باطل ٹھہرا اور وہ اجرت جس پر آپ نے ہم کو کام پر لگایا تھا اپنے پاس رکھو۔ تو اس نے ان سے بھی کہا کہ بقیہ دن تھوڑا رہ گیا ہے یہ کام پورا کرو اور اجرت پوری لو تو انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس شخص نے ایک اور قوم کو کام پر لگایا کہ بقیہ دن میں کام پورا کرے تو انہوں نے بقیہ دن میں کام پورا کر دیا یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا اور انہوں نے پوری مزدوری، پہلے اور دوسرے مزدوروں کی بھی پائی۔ تو یہ مثال ہے یہود و نصاریٰ کے اس نور کی جو انہوں نے چھوڑا اور مثال ہے مسلمانوں کے اس نور کی جو انہوں نے قبول کیا۔

وضاحت: سبحان اللہ! یہ اصل روایت آ گئی اور یہ قرآن کے عین مطابق ہے۔ اس میں بیان کردہ تمثیل کی مصداق وہ تینوں امتیں ہیں جن کو وحی الٰہی کا نور پھیلانے کے لیے مختلف زمانوں میں منتخب کیا گیا۔ سب

سے پہلے بنی اسرائیل کو اس شرف سے نوازا گیا۔ انہوں نے ایک طویل مدت تک اپنی ذمہ داریاں ادا کیں لیکن اس کے بعد وہ منحرف ہو گئے۔ نور پھیلانے کی ذمہ داری کو بھلا بیٹھے اور خدا کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جن کی تعلیم کے نتیجہ میں نصاریٰ نور کے حامل بن گئے جو ایک عرصہ تک اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ بالآخر وہ بھی ہدایت کو بھلا کر اپنی بدعات کے پیچھے لگ گئے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ایک اور قوم یعنی بنو اسماعیل کو کام پر لگایا جو آخر وقت تک یہ ذمہ داری ادا کرے گی۔ نبی ﷺ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد کوئی اس منصب کا حامل نہیں آئے گا۔ آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ میرے آنے کے بعد اب قیامت کے آنے میں کوئی طویل مدت حائل نہیں ہے۔ گویا کام کا دن اب جلد تمام ہونے والا ہے۔

قرآن مجید نے اچھے اہل کتاب کو بالعموم یہ دعوت دی ہے کہ وہ نبی امی ﷺ پر ایمان لے آئیں تو ان کو اللہ کی رحمت کے دو حصے ملیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس حق کی بھی گواہی دی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سابق نبیوں پر نازل ہوا اور اس حق کی شہادت بھی دیں گے جو نبی امی ﷺ کے واسطے سے پھیلا۔

امت مسلمہ دوہرے اجر کی مستحق اس لیے ہے کہ یہ اس تمام حق کی، بلا کسی تفریق و تحریب کے گواہی دینے والی ہے جو سابق انبیاء پر اور آخر میں کامل شکل میں نبی ﷺ پر نازل ہوا۔

تمثیل میں نور سے مراد وہ نور ایمان ہے جو اللہ کی ہدایت کو قبول کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتا اور اس کو ترک کرنے کے نتیجہ میں چھن جاتا ہے۔

اس تمثیل سے آنحضرت ﷺ نے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں پہلی امتوں کا کیا رول رہا اور اس امت کو جو شرف حاصل ہوا ہے اس کو وہ کیسے دنیا کی بساط لپیٹے جانے تک نبھائے گی۔

یہ تو تھی تمثیل کی وضاحت اور یاد ہو گا اوپر یہی تمثیل دو روایتوں کی صورت میں گزر چکی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تینوں روایتوں کے بیان میں اتنا فرق کیوں ہو گیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تیسری روایت، جو قرآن سے مطابقت رکھتی ہے، اصل ہے۔ اگر یہ روایت نہ ملتی تو مسئلہ کا حل نہیں تھا۔ لیکن اب مل گئی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ روایت ان دونوں روایتوں پر حاکم ہو جائے گی۔ محدثین کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ جہاں انہیں روایتوں کے بیان میں تضاد نظر آتا ہے کہہ دیتے ہیں کہ یہ الگ الگ واقعات ہیں۔ حالانکہ واقعہ ایک ہی ہوتا ہے۔ فرق راویوں کے بیان کرنے میں ہوتا ہے۔ مثلاً یہاں سابقہ دو روایتیں حضرت ابن عمرؓ سے ہیں، وہ بات الٹ پلٹ کیسے کر سکتے ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ بیچ کے راویوں نے بات سمجھی نہیں اور اپنے اپنے فہم اور تصور کے مطابق روایت کر دی جس سے کئی سوالات پیدا ہو گئے۔

روایت بالمعنیٰ کی وجہ سے بعض دفعہ یا تو راوی مطلب اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے یا ٹھیک طریقہ پر

ادا نہیں کر پاتے اور بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اس کا حل اگرچہ مشکل ہے لیکن ایک آسان طریقہ بھی ہے جو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی توفیق بخشی سے واضح ہوا ہے کہ ہر باب میں کلید باب کو معین کرنا چاہیے۔ یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ باب میں جو ایک مضمون کی حامل روایات ہیں ان میں کلیدی روایت کون سی ہے۔ مثلاً یہاں ان تینوں روایتوں میں یہ آخری روایت کلیدی قرار پاتی ہے۔ تو جو روایتیں اس کے خلاف ہوں گی وہ نظر انداز کر دی جائیں گی یا ان کو کلیدی روایت کی روشنی میں حل کرنا ممکن ہو تو حل کیا جائے گا۔ اس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسلم شریف کو استعمال کیا جائے۔ دوسری کوئی کتاب ایسی نہیں جو اس بارے میں مسلم شریف جیسی مفید ثابت ہو۔ بخاری شریف کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا بڑی مشقت کا کام ہے۔ اس کی ترتیب فقہی ہے اور امام صاحب احادیث کے مختلف ٹکڑے ادنیٰ مناسبتوں سے باب میں لاتے ہیں۔ اس لیے کلیدی روایت کو تلاش کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ مسلم شریف میں یہ بات ہے کہ اس میں ایک باب کی روایات بیشتر اسی باب میں نقل ہیں۔ اگر روایات میں کوئی الجھن نہ ہو تب تو بات صاف ہے لیکن اگر الجھن ہے اور کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو پھر کلیدی روایت کو تلاش کرنا ہو گا۔ جو لوگ حدیث پر کام کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ مسلم شریف پر اس نگاہ سے غور کرنا شروع کر دیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی باب میں کلیدی روایت تلاش کرنے میں ناکامی ہو۔ اس کام میں محض سند کو دیکھنا کافی نہیں ہو گا۔ اس کے لیے عقل سلیم، احادیث کا وسیع علم اور قرآن مجید پر گہری نظر درکار ہو گی۔

امام صاحب کا یہ عجیب ماجرا ہے کہ یہ حدیث بہت اہم بھی ہے اور نہایت شاندار بھی جس میں مسلمانوں اور دوسری ملتوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے لیکن انہوں نے اس کو صرف یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کہ مزدور کو اجرت پر رکھنا جز وقتی (Part time) بھی ہو سکتا ہے۔ بھلا اس امر میں کس کو شک ہے۔ یہ کام ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ اس کا تعلق کامن سنس سے ہے۔ دن بھی بہر حال منقسم ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے خود لکیریں کھینچ دی ہیں۔ اس کی تقسیم میں کوئی نزاع اور الجھن نہیں ہے۔ اب ہوا یہ ہے کہ تیسری روایت جو صحیح ثابت ہوتی ہے وہ امام صاحب کی بات کی بالکل نفی کر دیتی ہے اور ان کے حریفوں کے مذہب کو ثابت کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اجارہ پورے دن کا ہونا چاہیے۔ حدیث میں مالک نے ہر ایک کو پورے دن کے لیے نوکر رکھنا چاہا۔ یہ تو نوکروں کی اپنی کمزوری تھی کہ انہوں نے پورا دن کام نہ کیا۔ اب فرض کر لیجیے کہ اس حدیث کی روشنی میں ثابت کر دیا جائے کہ صرف پورے دن کا اجارہ ہے تو زندگی تو معطل ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب نے ایک غیر متعلق روایت سے اس مسئلہ کو ثابت کرنا چاہا جو نہ ہو سکا اور وہی چیز ثابت ہو گئی جس کو ثابت نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شارحین میں سے کسی کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ جب روایت بخاری میں ہے اور امام صاحب اس سے دلیل اخذ کر رہے ہیں تو اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

امین احسن اصلاحی

روزے کے احکام

(موطا امام مالکؒ کی کتاب الصیام کی روایات)

النذر فی الصیام والصیام عن المیت

روزہ کی نذر ماننا اور میت کی طرف سے روزے رکھنا

☐ حدثنی یحیٰی عن مالک انہ بلغہ عن سعید بن المسیب انہ سئل عن رجل نذر صیام شہر ھل لہ ان یتطوع. فقال سعید لیبدأ بالنذر قبل ان یتطوع. قال مالک بلغنی عن سلیمان بن یسار مثل ذالک.

ترجمہ:۔ سعید بن مسیب سے فتویٰ پوچھا گیا ایک ایسے شخص کے بارے میں کہ جس نے ایک مہینے کے روزوں کی نذر مانی۔ کیا اس کے لیے یہ بات جائز ہوگی کہ وہ کوئی نفلی روزہ رکھے؟ تو سعید بن مسیب نے کہا کہ وہ نذر پوری کرے قبل اس کے کہ کوئی اور روزہ رکھے۔ مالک کہتے ہیں کہ مجھ کو سلیمان بن یسار سے بھی ایسی ہی بات پہنچی ہے۔

وضاحت:۔ جب کسی نے روزہ رکھنے کی نذر مان لی تو گویا اس نے روزہ اپنے اوپر واجب کر لیا، لہٰذا بہتر ہے کہ پہلے نذر پوری کرے۔ سلیمان بن یسار بھی سعید بن مسیب کی طرح مدینہ کے بڑے فقہاء میں سے ہیں اور ان کی بھی یہی رائے ہے کہ پہلے نذر پوری کی جائے۔

امام مالک کا فتویٰ ہے کہ جو مر گیا اور اس کے ذمہ ایک غلام آزاد کرنے کی یا روزہ کی یا صدقہ یا قربانی پیش کرنے کی نذر ہے اور اس نے یہ وصیت کی کہ یہ اس کے مال میں سے پوری کی جائے تو صدقہ اور قربانی تو اس کے ثلث مال میں سے پوری کی جائے گی اور ان کو دوسری وصیتوں پر مقدم رکھا جائے گا، الا آنکہ دوسری وصیتیں اسی درجہ کی ہوں۔ نذروں اور صدقات وغیرہ کا اسی طرح پورا کرنا اس کے لیے ضروری نہ ہوگا جیسی اس نے نفل نیت کی جو واجب نہ تھی، بلکہ یہ سب اس کے ثلث مال ہی میں خاص طور پر واجب ہوں گی۔ راس المال میں نہیں۔ کیونکہ اگر یہ اس کے راس المال میں جائز ہوتیں تو ایسا متوفی اس طریقہ کے تمام امور واجبہ کو اپنے اوپر سے ٹالتا رہتا یہاں تک کہ جب موت کا وقت آتا اور مال وارثوں کا

ہو جاتا تو وہ اس طریقہ کی ساری چیزوں کا نام لے لیتا جن کا کوئی تقاضا کرنے والا تو نہیں تھا۔ اگر یہ اس کے لیے جائز ہو تو اس طرح کی اشیاء کو موخر کرے گا یہاں تک کہ جب موت آئے گی تب وہ اس کا اظہار کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس کے پورے مال کا احاطہ کر لے جو مال اب اس کا نہیں۔

امام مالک کی رائے یہ ہے کہ نذریں سب ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ورثاء کے مال کو بچانے کے لیے انہوں نے یہ کیا ہے کہ جو ذمہ داریاں واجب ہوں گی مثلاً صدقہ، قربانی وغیرہ تو وہ اس کے ثلث مال میں سے پوری کی جائیں گی۔ جو اس کی نذریں نفلی ہیں وہ پوری نہیں کی جائیں گی۔ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اب اگر واجب اخراجات ثلث مال سے پورے نہیں ہوتے تب کیا کیا جائے گا؟ بہرحال اس طریقہ سے راہ نکلتی ہے کہ جائز وارثوں کو ان کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔

☐ و حدثنی عن مالک انہ بلغہ ان عبداللہ بن عمر کان یسال ھل یصوم احد عن احد او یصلی احد عن احد فیقول لا یصوم احد عن احد ولا یصلی احد عن احد.

ترجمہ:۔ امام مالک سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ جب عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا جاتا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے روزہ رکھے یا نماز پڑھے تو کیسا ہے تو وہ جواب دیتے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے نہ روزہ رکھے نہ نماز پڑھے۔

وضاحت:۔ ایک خاتون آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں اور کہا کہ میری ماں نے روزہ رکھنے کی منت مانی تھی لیکن نہ رکھ سکی۔ اب اگر میں رکھوں تو کیسا ہے؟ تو آپ نے فرمایا اگر اس کا قرض ہوتا اور تم ادا کرتیں تو ادا ہو جاتا؟ اس نے کہا جی ہاں، آپ نے فرمایا تو اللہ کا حق ادا کرنا مقدم ہے۔ یہ روایت مرفوع ہے اور اوپر عبداللہ بن عمرؓ کا اثر بیان ہوا ہے۔ تو اثر میں اور خبر میں بڑا فرق ہے۔ ان دونوں میں تطبیق کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ زندگی سے متعلق ہے یعنی کسی کی زندگی میں کوئی شخص اس کی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے نہ روزہ رکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر مرنے کے بعد، کوئی منت اس کی رہ گئی ہے تو قریبی اعزا میں سے، بیٹا یا بیٹی یا کوئی اور، اس کی طرف سے اس منت کو پورا کر دے تو امید ہے کہ انشاءاللہ اللہ کا حق ادا ہو جائے گا۔ یہی صورت حج بدل میں ہوتی ہے۔ حقوق العباد میں مثلاً قرض ہے تو وہ ورثا کے ادا کرنے سے ادا ہو جاتا ہے۔ روزہ نماز وغیرہ حقوق اللہ میں سے ہیں تو اللہ میاں کے پاس کیا کمی ہے کہ وہ قبول نہ کرے گا۔ ابن عمرؓ کے اثر کا ایک خاص دائرہ جانیے تو روایت کے ساتھ اس کی تطبیق ہو جائے گی۔

ما جاء في قضاء رمضان والكفارات

رمضان کے روزہ کی قضا اور کفارات کے بارے میں روایات

☐ حدثني يحيىٰ عن مالك عن زيد بن اسلم عن اخيه خالد بن اسلم ان عمر بن الخطاب فطر ذات يوم في رمضان في يوم ذى غيم و راى انه قد امسى و غابت الشمس فجاء ہ رجل فقال يا اميرالمومنين طلعت الشمس ، فقال عمر الخطب يسير و قد اجتهدنا. قال مالك يريد بقوله الخطب يسير القضاء فيما نرى والله اعلم و خفة مؤونته و يسارته يقول يصوم يوما مكانه.

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ نے رمضان میں ایک دن، جب کہ بادل چھائے ہوئے تھے، اس خیال سے افطار کیا کہ شام ہوگئی ہے اور سورج غروب ہو چکا ہے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ یا امیرالمومنین سورج تو یہ نکل آیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا، کچھ پیچیدہ معاملہ نہیں، ہم نے اجتہاد کیا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ جہاں تک ہمارا خیال ہے الخطب یسیر سے مراد قضاء لیا ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے یعنی یہ ہلکی ذمہ داری ہے اور سہل ہے کہ ایک دن کا روزہ اس کی جگہ رکھ لیا جائے۔

وضاحت:۔ امام مالک نے الخطب یسیر سے مراد قضا لیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں الخطب یسیر قد اجتہدنا یعنی ہم نے اجتہاد کیا تھا۔ معاملہ آسان ہے کوئی پیچیدہ نہیں۔ گویا ہمارا روزہ ہوگیا۔ یہ دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ دن باقی ہے تو پھر شام تک اور کچھ کھائے پیئے نہیں اور روزے میں اس سے کوئی خرابی نہیں۔ یہ بھی ایک فتویٰ ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ اجتہاد سے روزہ کھول لینے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوا۔ البتہ یہ ہے کہ سورج نکل آنے کے بعد شام تک کچھ کھایا پیا نہ جائے۔ اس کی قضا ضروری نہیں۔

☐ و حدثني عن مالك عن نافع ان عبدالله بن عمرؓ كان يقول: يصوم قضاء رمضان متتابعا من افطره من مرضي، او في سفر

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے رمضان میں روزے مرض یا سفر کے باعث افطار کیے ہوں وہ ان کی قضا مسلسل رکھے۔

وضاحت:۔ یعنی فرض کیجئے کہ کسی نے بیماری کی وجہ سے رمضان کے دس روزے چھوڑ دیئے تو جب وہ

قضاء کرے گا تو عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ دس روزے مسلسل رکھ کر قضا پوری کرے گا۔

☐ و حدثني عن مالك عن ابن شهاب ان عبدالله بن عباس و اباهريرةؓ اختلفا في قضاء رمضان، فقال احدهما يفرق بينه، و قال الاخر لا يفرق بينه، لا ادرى ايهما قال يفرق بينه.

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ میں رمضان کے روزوں کی قضا کے بارے میں اختلاف ہوا۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ ان روزوں کے درمیان تفریق ہو سکتی ہے اور ایک کی رائے یہ تھی کہ تفریق نہیں ہو سکتی۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ کس کی رائے یہ تھی کہ تفریق ہو سکتی ہے۔

وضاحت:۔ صاف بات یہ ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کی رائے یہ رہی ہوگی کہ روزوں کے درمیان تفریق ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں کہ تفریق نہ ہو سکے، معقول بات ہے، الدین یسر۔ دین میں آسانی کا پہلو لینا چاہیے۔ ایک بات یاد رکھیے کہ یہ سب آثار ہیں، مرفوع احادیث نہیں ہیں۔

☐ و حدثني عن مالك عن نافع عن عبدالله بن عمرؓ انه كان يقول: من استقاء وهو صائم فعليه القضاء و من ذرعه القئ فليس عليه القضاء.

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ جس نے قصداً قے کی اور وہ روزہ دار ہے تو اس کو روزہ قضا کرنا پڑے گا اور جس کے اوپر قے غالب آ گئی تو اس کے لیے قضا نہیں ہے۔

☐ و حدثني عن مالك عن يحيىٰ بن سعيد انه سمع سعيد بن المسيب يسئل عن قضاء رمضان، فقال: سعيد احب الي ان لا يفرق قضاء رمضان و ان يواتر.

ترجمہ:۔ سعید بن مسیب سے قضاء رمضان کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ رمضان کے روزوں کی قضاء میں تفریق نہ کرے بلکہ مسلسل رکھے۔

وضاحت:۔ پسندیدہ بات یہ ہے کہ روزوں کی قضاء مسلسل پوری کی جائے۔ البتہ اگر کوئی چاہے تو تفریق بھی کر سکتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے اور یہ ٹھیک ہے۔

امام مالک کے فتوے:

یحییٰ کہتے ہیں کہ ہم نے امام مالکؒ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ جس نے رمضان کے روزوں کی قضاء میں تفریق کر دی تو اعادہ نہیں ہوگا اور یہ ان کا بدل ہو جائے گا لیکن پسند مجھے یہ ہے کہ وہ مسلسل

روزے رکھے۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ جس نے رمضان کے روزہ میں سہو سے یا نسیان سے کھالیا یا پی لیا تو اس پر اس کے بدل ایک روزہ قضاء رکھنا واجب ہے۔ اس فتویٰ میں سہو سے، یا نسیان سے، دونوں میں کیا فرق ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔

□ **و حدثنی عن مالک عن حمید بن قیس المکی انہ اخبرہ قال: کنت مع مجاھد و ھو یطوف بالبیت فجاء ہ انسان فسالہ عن صیام ایام الکفارۃ أمتتا بعات ام یقطعھا قال حمید فقلت لہ نعم یقطعھا ان شاء . قال مجاھد لا یقطعھا فانھا فی قراۃ ابی بن کعب ثلاثۃ ایام متتابعات قال مالکؒ و احب الی ان یکون ما سمی اللہ فی القرآن یصام متتابعا .**

ترجمہ:۔ حمید بن قیس المکی کہتے ہیں کہ میں بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے مجاہد کے ساتھ تھا تو ایک شخص آیا اور ان سے ایام کفارہ کے روزوں کے بارے میں فتویٰ پوچھا کہ کیا مسلسل رکھنے پڑیں گے یا ان کے درمیان تفریق کر سکتا ہے۔ تو حمید کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا کہ ہاں وہ ان کو قطع کر سکتا ہے اگر چاہے۔ تو مجاہد نے کہا کہ نہیں، کیونکہ ابی بن کعب کی قرات میں **ثلاثہ ایام متتابعات** کے الفاظ آتے ہیں۔ مالک کہتے ہیں کہ میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ جن کا نام قرآن نے لیا ہے وہ روزے مسلسل ہی رکھے جائیں۔

وضاحت:۔ ابی ابن کعب کی قرأت میں الفاظ "**ثلاثۃ ایام متتابعات**" آئے ہیں تو میرے نزدیک یہ ان کی اپنی تاویل ہے۔ اسے قرأۃ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ قرات متواتر تو ایک ہی ہے جو ہمارے مصاحف میں ہے اور وہ قرات حفص ہے۔ اس طریقہ کی جو دوسری قراتیں ہیں میں ان کو تاویل و تغیر مانتا ہوں۔ قرات حفص متواتر قرات ہے، جس پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے امت کو مجتمع کیا ہے۔

امام مالک کہتے ہیں کہ میرے نزدیک محبوب بات یہ ہے کہ جن کا اللہ نے قرآن میں نام لیا ہے وہ روزے مسلسل ہی رکھے جائیں۔ امام مالک نے اچھا کیا کہ اس فتویٰ کو پسندیدہ کی حد تک ہی رکھا ہے تاکہ دوسرے نقطہ ہائے نظر کی گنجائش رہے۔

امام مالک کے فتوے:

امام مالک سے فتویٰ پوچھا گیا کہ ایک عورت کو ماہ رمضان میں روزہ کی حالت میں معمول کے ایام حیض کے علاوہ یک لخت تازہ خون خارج ہونے کا واقعہ پیش آتا ہے۔ وہ دن بھر مزید خون آنے کی

منتظر رہتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا اور شام ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن پھر صبح کو وہی واقعہ پیش آتا ہے لیکن اس مرتبہ پہلے سے کم خون خارج ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصل ایام حیض پر یہ سلسلہ منقطع رہتا ہے۔ اب وہ عورت اپنے نماز روزے کے معاملہ میں کیا طریقہ اختیار کرے۔ امام مالک نے جواب دیا کہ یہ خون حیض ہی کا مانا جائے گا۔ جب ایسا واقعہ پیش آئے تو عورت روزہ نہ رکھے اور بعد میں اس کی قضا کرے۔ جب خون آنا منقطع ہو جائے تو غسل کرے اور روزے رکھے۔

امام مالکؒ سے یہ فتویٰ بھی پوچھا گیا کہ جو شخص ماہ رمضان کی آخری تاریخ کو اسلام لایا تو کیا اس پر پورے ماہ کے روزوں کی قضا ہو گی یا صرف اسی دن کے روزے کی جس میں اس نے اسلام قبول کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس پر گزرے دنوں کی قضا نہیں ہو گی۔ وہ اگلے دن سے روزے کا آغاز کرے گا۔ لیکن میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ وہ اس دن کی بھی قضا کرے جس دن وہ اسلام لایا۔

امام صاحب کا پسندیدہ فتویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر عصر کے وقت اسلام لایا تھا تو وہ مغرب تک روزہ پورا کرے گا، کچھ کھائے گا پئے گا نہیں اور پھر اگلے دن سے روزہ رکھے گا۔

قضاء التطوع

نفلی روزہ توڑنے کی قضا کیسے ہو گی

□ **حدثنی یحیٰی عن مالک عن ابن شھاب ان عائشۃؓ و حفصۃؓ زوجی النبی ﷺ اصبحتا صائمتین متطوعتین فاھدی الیھما طعام فافطرتا علیہ فدخل علیھما رسول اللہ ﷺ قالت عائشۃ فقالت حفصۃؓ و بدرتنی بالکلام و کانت بنت ابیھا یا رسول اللہ انی اصبحت انا و عائشۃؓ صائمتین متطوعتین فاھدی الینا طعام فافطرنا علیہ. فقال رسول اللہ ﷺ اقضیا مکانہ یوما آخر.**

ترجمہ:۔ ابن شہاب سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، دونوں نے اس حالت میں صبح کی کہ دونوں نے نفلی روزہ کی نیت کر رکھی تھی تو ان کے پاس کھانا ہدیہ بھیجا گیا اور ان دونوں نے اس پر افطار کر لیا۔ تو جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حفصہ نے مجھ سے کلام میں سبقت کی اور آخر وہ اپنے باپ ہی کی بیٹی تھیں، اور یہ کہا یا رسول اللہ! میں نے اور عائشہ نے نفلی روزے کی نیت کی تھی تو کھانا ہمارے پاس ہدیہ آیا اور ہم نے افطار کر لیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ پر

ایک دن کا روزہ رکھ لو۔

وضاحت:۔ اس سے یہ حکم معلوم ہوا کہ آدمی نفلی روزہ رکھے ہوئے ہو تو ضرورت پڑنے پر افطار کر سکتا ہے لیکن اس کی قضا کرنی ہوگی۔ احناف کے نزدیک قضا واجب ہے اس لیے کہ وہ امر کو وجوب کے معنی میں لیتے ہیں۔ لیکن اور لوگ مثلاً شوافع کہتے ہیں کہ قضا واجب نہیں ہے۔

فلسفہ دین کی رو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کسی نیکی کا ارادہ کرے تو اس کو پورا کرنا چاہیے ورنہ کردار کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اگر آدمی نفلی کاموں کی نیت کرے اور پھر اس کو توڑ دینے پر کوئی گرفت نہ ہو تو ایک طرح کا ڈھیلا پن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے احناف کا مسلک فلسفہ دین کے پہلو سے مضبوط ہے لیکن امر کو وجوب کے لیے خاص کر لینا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے۔ باقی شوافع وغیرہ نے اس کے خلاف کہا ہے تو انہوں نے امر کے پہلو کو نہیں لیا ہے۔ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ مالکیہ وغیرہ کی جو رائے ہے وہ بھی احناف کی تائید میں نکلتی ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آدمی کسی نیکی کا ارادہ کرلے تو اس کو پورا کرے۔

روایت میں حضرت عائشہؓ کا یہ فقرہ کہ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو حفصہ نے کلام میں مجھ سے سبقت کی اور آخر وہ اپنے باپ ہی کی بیٹی تھیں، غور طلب ہے۔ اس فقرہ کو کوئی بدنیت آدمی برے معنی میں اور نیک نیت آدمی اچھے معنوں میں لے سکتا ہے۔ برے معنوں میں مفہوم یہ ہوگا کہ ہر معاملہ میں مداخلت کرنا ان کی عادت تھی۔ اچھے معنی میں مفہوم یہ ہوگا کہ آخر وہ نامور باپ کی بیٹی تھیں، جس طریقہ سے باپ ہر نیک کام میں سبقت کرتے تھے اسی طریقہ سے ان کی بیٹی نے بھی مسئلہ دریافت کرنے میں سبقت کی۔ عام مورخین و مفسرین چونکہ سیدات کا کردار شیعہ روایات کے زیر اثر دیکھتے ہیں تو وہ اس کے معنی برے ہی لیتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سیدات میں تعلقات بہت اچھے تھے۔ یہ بات بھی تھی کہ دونوں بڑے باپوں کی اولاد تھیں۔ عام لوگ بھی اس رمز سے واقف تھے اور انہی دونوں کے پاس زیادہ ہدیے آتے۔ چنانچہ یہاں بھی ہدیہ دونوں کے پاس آیا اور دونوں نے نفلی روزہ افطار کر لیا۔ سورہ تحریم کی تفسیر کرتے ہوئے میں نے لکھا ہے کہ سوکن کے جلاپے، حسد اور عناد کی شکل میں یہ بات نہیں ہوتی کہ شوہر کے راز کی باتیں اس کی ایک بیوی دوسری بیوی سے کہہ دے۔ یہ تو حسن ظن اور اعتماد کی بناء پر ہوتا ہے۔ یہ چیز بھی ان کے آپس کے خوشگوار تعلقات کی دلیل ہے تو خواہ مخواہ کو برے معنی کیوں لیے جائیں۔ جو اچھے معنی بنتے ہیں وہی لیے جائیں۔ میرے نزدیک جملے کی صحیح تاویل یہی ہے کہ وہ بڑے باپ

کی بیٹی تھیں اور جس طریقہ سے سبقت کرنی چاہیے تھی انہوں نے کی اور جاننا چاہا کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیے۔

امام مالک کے فتوے:

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالک کا فتویٰ سنا ہے کہ جو شخص بھول کر یا غفلت سے نفلی روزہ میں کھا پی لے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ لیکن وہ اس دن کا روزہ پورا کرے گا جس دن اس نے کھایا اور اس شخص پر بھی، جس کو ایسی ضرورت لاحق ہوگئی کہ نفلی روزہ توڑنا پڑا، قضا نہیں ہے جب کہ اس نے یہ افطار کسی عذر کی بنا پر کیا ہو جس میں تعمد کو دخل نہ ہو۔ میں اس شخص پر بھی نفلی نماز کی قضا ضروری نہیں سمجھتا جس کو اس نے اس حدث کی بنا پر توڑا ہو جس کو روکنے پر وہ قادر نہ تھا۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ کوئی شخص جب اعمال صالحہ میں سے کسی کام میں اقدام کرے، نماز ہو، روزہ ہو، حج ہو یا اس طرح کی جتنی چیزیں اعمال صالحہ میں شامل اور ہیں اور جو نفلی عبادت کے طور پر کی جاتی ہیں، تو اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کو توڑ دے، اس وقت تک جب تک کہ وہ اس کو ضابطہ کے مطابق پورا نہ کرلے۔ جب تکبیر کہہ دے تو سلام نہ پھیرے جب تک کہ دو رکعت نماز نہ پڑھ لے۔ جب روزہ رکھے تو افطار نہ کرے یہاں تک کہ اپنا روزہ پورا کرلے۔ جب تلبیہ کہہ دے تو نہ لوٹے جب تک کہ اپنا حج پورا نہ کرلے۔ جب طواف میں داخل ہو جائے تو اس وقت تک نہ فارغ ہو جب تک کہ سات پھیرے پورے نہ کرلے۔ اس کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ان کاموں میں سے کسی میں داخل ہونا چاہے تو پھر اس کو چھوڑ دے جب تک کہ اس کو پورا نہ کرلے، الا یہ کہ یہ چھوڑنا کسی ایسے امر کے سبب سے ہو کہ اس کو کوئی بیماری لاحق ہو جائے جس کی بنا پر لوگ اس کو معذور سمجھیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے ممیّز نہ ہو جائے اور روزے کو پورا کرو رات تک۔ لہٰذا روزہ رکھنے والے پر روزے کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔ اگر کوئی شخص نفلی حج کی تکبیر کہہ دے اور اس نے فریضہ ادا کر رکھا ہو تو اس کے لیے جائز نہیں کہ حج چھوڑے جب کہ وہ اس میں داخل ہو گیا ہے اور حلت کی حالت میں راستہ سے لوٹے۔ پس جو شخص کسی بھی نفلی کام میں داخل ہو جائے تو اس کے اوپر اس کا پورا کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طریقہ سے کہ فریضہ کو پورا کیا جاتا ہے۔ میں نے جو کچھ سنا ہے اس میں بہترین بات یہی ہے۔

مختصر الفاظ میں امام صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دین کے کسی کام میں اگر نفلی طور پر بھی آپ نے

قدم بڑھا دیا تو پھر سعادت اسی میں ہے کہ اس کو پورا کیا جائے الا آنکہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ فلسفہ وہی ہے کہ آدمی میں ضعف اور کمزوری نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ جب ارادہ کرے تو پورا کرے۔ آیات سے امام صاحب نے جو استدلال کیا ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے۔ آیات اس سیاق میں نہیں ہیں جو امام مالک کہنا چاہتے ہیں۔ امام مالک کی بات اپنی جگہ پر تربیت نفس کے لحاظ سے صحیح ہے۔ آخر میں انہوں نے جو یہ کہا ہے کہ نفلی عبادت کو اسی طریقہ سے پورا کیا جانا چاہیے جس طریقہ سے کہ فریضہ کو پورا کیا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت تاکید کر رہے ہیں۔ میری رائے میں ہر نفلی عبادت کو پورا کرنے کا عزم ہونا چاہیے اور حتی الوسع آدمی اس کو بیچ میں نہ چھوڑے۔ یہ چیز تربیت نفس کے لحاظ سے بھی ضروری ہے لیکن اس کو واجب یا فریضہ قرار دینا صحیح نہیں۔

فدية من افطر فی رمضان عن علة

جو شخص رمضان کے روزے بیماری کے باعث چھوڑ دے تو اس کا کیا فدیہ ہے

☐ حدثنی عن یحیی عن مالک انه بلغه ان انس بن مالک کبر حتی کان لا یقدر علی الصیام فکان یفتدی قال مالک ولا اری ذالک واجبا واحب الی ان یفعله اذا کان قویا علیه فمن فدی فانما یطعم مکان کل یوم مدا بمد النبی ﷺ

ترجمہ:۔ مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ انس بن مالکؓ بہت بوڑھے ہو گئے تو روزہ نہیں رکھ سکتے تھے اور فدیہ دے دیتے تھے۔ امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ واجب نہیں ہے لیکن اگر کوئی دے سکتا ہے تو پسندیدہ ہے۔ اور جو فدیہ دینا چاہے تو ہر ایک دن کے بدلے ایک مد نبی ﷺ کے مد کے حساب سے دے۔

وضاحت:۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ فدیہ دینا واجب نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے۔ اگر آدمی کھاتا پیتا ہے، خوشحال ہے تو فدیہ دے لیکن واجب نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہے اور روزہ کی وجہ سے بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہے تو ڈاکٹر کے مشورہ سے روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ اگر وہ کھاتا پیتا اور خوشحال ہے تو فدیہ دے لیکن یہ واجب نہیں ہے۔ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں اور ایک مد آدھ کلو غلہ کے برابر ہوگا۔

☐ و حدثنی عن مالک انه بلغه ان عبدالله بن عمر سئل عن المراة الحامل اذا خافت علی ولدها و اشتد علیها الصیام: قال تفطر و تطعم مکان کل یوم مسکینا مدا من

حنطة بمد النبی ﷺ قال مالک و اهل علم یرون علیها القضاء کما قال الله عزوجل: فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدة من ایام اخر. و یرون ذالک مرضا من الامراض مع الخوف علی ولدها.

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرؓ سے فتویٰ پوچھا گیا کہ ایک حاملہ عورت اگر بچے کے متعلق اندیشہ رکھتی ہے، روزہ اس پر شاق گزرتا ہے تو کیا حکم ہے، انہوں نے کہا کہ وہ افطار کر سکتی ہے اور ہر دن کے بدلے میں ایک مسکین کو ایک مد گندم دے گی۔ مالک کہتے ہیں کہ اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس کے اوپر قضاء ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم میں کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ یہ اہل علم حاملہ عورت کو مریض کے حکم میں رکھتے ہیں اور مریض کے لیے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنے کا حکم ہے۔

وضاحت:۔ یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک صرف فدیہ دینا ہے۔ لیکن اہل علم (مراد فقہائے مدینہ ہیں) کے نزدیک اس صورت میں قضا ہے۔ وہ حاملہ عورت کو مریض کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ مالکیہ کا عمل بھی یہ ہے کہ وہ حاملہ کو مریض کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

☐ و حدثنی عن مالک عن عبدالرحمن بن القاسم عن ابیه انه کان یقول: من کان علیه قضاء رمضان فلم یقضه وهو قوی علی صیامه حتی جاء رمضان آخر فانه یطعم مکان کل یوم مسکینا مدا من حنطة و علیه مع ذالک القضاء.

ترجمہ:۔ عبدالرحمن اپنے باپ قاسم کا یہ قول نقل کرتے تھے کہ جس کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا باقی تھی اور وہ روزے رکھنے پر قادر ہوتے ہوئے روزہ نہ رکھ سکا یہاں تک کہ دوسرا رمضان آ گیا، تب وہ کھانا کھلائے گا ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو ایک مد، اور علاوہ اس کے قضاء بھی پوری کرے گا۔

وضاحت:۔ اس کی علت سمجھ میں نہیں آئی کہ کھانا بھی کھلائے گا اور روزے بھی پورے کرے گا۔ گویا قاسم نے روزہ نہ رکھنے پر جرمانہ کیا اور روزے کی قضا بھی باقی رکھی۔ مالک کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر سے بھی یہی بات ان کو پہنچی ہے۔

جامع قضاء الصيام

روزہ کی قضاء کے باب میں جامع بات

❑ حدثنی یحیی عن مالک عن یحیی بن سعید عن ابی سلمة بن عبدالرحمن انه سمع عائشةؓ زوج النبی ﷺ تقول: ان کان لیکون علی الصیام من رمضان فما استطیع اصومه حتی یاتی شعبان.

ترجمہ:۔ سلمیٰ بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ میرے ذمہ رمضان کے روزے ہوتے تھے اور میں اس کو پورا نہیں کر پاتی تھی یہاں تک کہ شعبان آ جاتا تھا۔

وضاحت:۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بہر حال وہ اگلے رمضان سے پہلے شعبان میں قضا پوری کر لیتی تھیں۔ گویا ایک رمضان کے قضا روزے آپ شعبان تک موخر کر سکتے ہیں لیکن دوسرا رمضان شروع ہونے سے پہلے شعبان میں رکھ لینے چاہئیں۔ اگر آپ نے نہیں رکھے اور دوسرا رمضان آ گیا تو پھر پچھلی روایت کی رو سے روزے بھی رکھے اور جرمانہ بھی دے۔

صيام يوم الذی يشک فيه

شک کا روزہ

امام مالک کہتے ہیں کہ انہوں نے (مدینہ کے) فقہاء سے سنا ہے کہ آدمی شعبان کی آخری تاریخ میں شک ہونے کی صورت میں رمضان کے روزہ کی نیت کر کے روزہ نہ رکھے۔ کوئی شخص بغیر چاند دیکھے روزہ رکھ رہا ہو اور پھر کوئی ثقہ آدمی آ کر بیان کرے کہ یہ رمضان کا دن ہے تو اس کے اوپر قضا ہو گی البتہ وہ اس کے روزوں کو نفلی ماننے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ مالک کہتے ہیں کہ یہی معاملہ ہمارے ہاں ہے اور اسی پر میں نے اہل علم (فقہاء مدینہ) کو پایا ہے۔

وضاحت:۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ شک کے روزہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ مثلاً آدمی یہ سمجھ کر کہ شعبان کے ۲۹ دن تو پورے ہو چکے ہیں اب کل رمضان کی پہلی تاریخ ہو گی، اگرچہ چاند دیکھا نہ گیا ہو، رمضان کا روزہ رکھ لے تو یہ صحیح نہیں۔ اس کی وجہ نفسیاتی ہے۔ میرے نزدیک ایسا کرنے سے اوہام پرستی پیدا ہوتی ہے اور یہ دین میں بہت بڑا فتنہ ہے۔ وہم نہیں ہونا چاہیے۔ دین میں جو بات ہو قطعیت کے ساتھ ہو۔

وہم کی بیماری ہندو راہبوں اور یہودیوں کے ہاں پائی جاتی ہے لیکن اسلام نے اس کی جڑ کاٹی ہے۔

جامع الصيام

روزہ کے بارے میں جامع روایات

❑ حدثنی یحیی عن مالک عن ابی النضر مولی عمر بن عبیدالله عن ابی سلمة بن عبدالرحمن عن عائشة زوج النبی ﷺ انها قالت: کان رسول الله ﷺ یصوم حتی نقول لا یفطر، و یفطر حتی نقول لا یصوم، وما رایت رسول الله ﷺ استکمل صیام شهر قط الا رمضان، وما رایته فی شهر اکثر صیاما منه فی شعبان.

ترجمہ:۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ روزے رکھنے لگتے تو ہم کہتے کہ معلوم ہوتا ہے اب روزہ رکھنا نہیں چھوڑیں گے اور افطار کرنے لگتے تو ہم کہتے کہ اب روزہ نہیں رکھیں گے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی ایک مہینے کا روزہ، سوائے رمضان کے، پورا رکھا ہو اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔

وضاحت:۔ یعنی رسول اللہ ﷺ روزے رکھتے تو رکھتے ہی چلے جاتے اور چھوڑتے تو پھر کئی کئی دن نہیں رکھتے تھے۔ اور شعبان میں سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے تو گویا یہ رمضان کے تیاری میں ہوتا تھا۔ نفس انسانی کے سب سے زوردار اور سرکش پہلو شہوات، خواہشات اور جذبات ہیں۔ روزے کی عبادت ایک طرف ان رجحانات کو کمزور کر کے اعتدال پر لاتی ہے اور دوسری طرف انسان کی قوت ارادی کو ان کو دبانے اور ان کو حدود الٰہی کا پابند بنانے کے لیے طاقتور بنا دیتی ہے۔ اس لیے اسلام نے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزوں کا اہتمام کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس بارے میں نبی ﷺ کے اپنے اختیار کردہ معمول پر روشنی ڈالی ہے۔

❑ **وحدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال: الصیام جنة، فاذا کان احدکم صائما فلا یرفث ولا یجهل. فان امرؤ قاتله او شاتمه فلیقل انی صائم انی صائم.**

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روزہ ڈھال ہے لہذا جب کوئی تم میں سے روزہ سے ہو تو چاہیے کہ وہ شہوت کی اور جہالت کی باتیں نہ کرے۔ اور اگر کوئی شخص اس سے لڑائی کرے یا اس کو گالی دے تو کہے، میں روزہ سے ہوں، میں روزہ سے ہوں۔

وضاحت:۔ یہ ہنر بتایا ہے کہ روزہ کو بطور ڈھال استعمال کرو۔ اگر کوئی لڑائی کرے یا گالی دے تو جواب میں کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں۔ اس سے غصہ بھی دور ہو جاتا ہے اور روزہ بھی خراب ہونے سے بچ جاتا ہے۔ 'روزہ سے ہوں' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی جذبات رکھتا ہوں، میرے منہ میں بھی زبان ہے لیکن میں روزہ سے ہوں۔ آدمی اس طرح غصہ نفسیاتی طور پر روک سکتا ہے۔ شریعت کا وہ حصہ جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے مضبوط صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس صبر کی مشق روزہ کی عبادت فراہم کرتی ہے۔ پھر اسی صبر اور برداشت کی تربیت سے قوت ارادی مضبوط ہوتی اور شریعت کے حدود پر قائم رہنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ اس کا نام تقویٰ ہے جس کو قرآن نے روزہ کا مقصود بتایا ہے۔ یہی قوت مومن کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جس سے وہ شیطان کے ہر وار کو روک سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ڈھال کی تشبیہ نہایت عمدہ ہے۔

☐ وحدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال: والذی نفسی بیده لخلوف فم الصائم اطیب عندالله من ریح المسک. انما یذر شهوته و طعامه و شرابه من اجلی، فالصیام لی، و انا اجزی به، کل حسنة بعشر امثالها، الی سبعمائة ضعف، الا الصیام فهو لی و انا اجزی به.

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے کہیں زیادہ خوشگوار ہے۔ بندہ اپنی خواہش نفس اور کھانا پینا میرے لیے چھوڑتا ہے تو روزہ میرے لیے ہوا اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ تمام نیکیوں کا صلہ دس سے لے کر سات سو گنا تک ہے سوائے روزہ کے جو خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔

وضاحت:۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں مقرر فرمائی ہیں سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں لیکن روزے میں ایک بندہ دنیا کی لذات کو ترک کر کے خدا سے قرب اور ملائکہ سے تشبہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرد، ترک دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے۔ لہٰذا اس مشقت کی بدولت کہ جو ایک بندہ اپنے رب سے قریب ہونے کے لیے اٹھاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنے ساتھ نسبت دی ہے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

خاص اپنے ہاتھوں سے جزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں

بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ جن حالات میں اور جن خصوصیات کے ساتھ کوئی نیکی کی جاتی ہے ان کے لحاظ سے ہر نیکی کا بدلہ دس گنا سے سات سو گنا تک ملے گا۔ لیکن روزے کا اجر اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے بلکہ جس روز جزا دینے کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے اس فارمولے کو کھولے گا۔ جس عبادت کی جزا کے لیے یہ کچھ اہتمام ہوگا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین کا بادشاہ اس کی کیا جزا دے گا۔

روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو مشک سے زیادہ پسند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مسواک کرنا چھوڑ دیں۔ آپ اپنا منہ مسواک سے صاف رکھیں گے تب بھی منہ میں باسی پن رہے گا جب تک کہ آپ افطار کے وقت کھا پی نہیں لیتے۔ فرمایا کہ وہ بو جو روزہ رکھنے کے باعث منہ میں پیدا ہوتی ہے کسی کو پسند ہو یا نہ ہو، رب کو پسند ہے اور مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔

☐ وحدثنی عن مالک عن عمه ابی سهیل بن مالک عن ابیه عن ابی هریرة انه قال: اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنة، و غلقت ابواب النار و صفدت الشیاطین.

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں لگا دی جاتی ہیں۔

وضاحت:۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ آتے ہی نیکی اور سعادت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ آدمی ایسے کام کر سکتا ہے جو اس کو جنت کا مستحق بنا دیں۔ اسی طرح فتنہ کے بڑے دروازوں کو روزہ بند کر دیتا ہے جو انسان کو دوزخ کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ فتنہ کے بڑے دروازے بطن اور فرج ہیں۔ ان کے سبب سے آدمی نہ جانے کتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ روزہ ان پر پہرہ لگانے کا بہتر سے بہتر انتظام کرتا ہے۔ شیاطین کو بیڑیاں لگا دی جاتی ہیں یعنی ان کی مداخلت کے راستوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمام وعدے ہر شخص کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس شخص کے لیے ہیں جو ماہ رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ روزہ رکھتا ہے۔ اس پر اگر باہر سے کوئی حملہ ہوتا ہے تو وہ روزہ کو ڈھال بنا لیتا ہے۔ اگر کوئی شیطانی تحریک ہوتی ہے تو وہ اپنا احتساب کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نگرانی بہرحال روزہ دار کو خود کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو شیطان اس کے آگے بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ حملہ آور ہونے کی جگہ ڈھونڈتا ہے لیکن اس کو کوئی راہ نہیں ملتی۔ اب اگر ماہ رمضان آ جانے کے باوجود کوئی شخص روزہ نہیں رکھتا یا روزہ تو رکھتا ہے لیکن اس کی خود نگرانی نہیں کرتا اور شیطان کے لیے دروازے چوپٹ کھول دیتا ہے تو یہ حدیث ایسے لوگوں کے لیے گارنٹی فراہم نہیں کرتی۔

امام مالک کے فتوے:

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ مسواک روزہ دار کے لیے رمضان میں دن کے کسی وقت میں مکروہ نہیں ہے، نہ دن کے اول حصہ میں نہ آخر میں اور میں نے کسی سے نہیں سنا کہ وہ اس کو مکروہ قرار دیتا ہو۔

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا کہ رمضان کے بعد چھ روزے رکھتا ہو، اور یہ بات سلف میں سے کسی کے متعلق مجھ تک نہیں پہنچی۔ بلکہ اہل علم اس کو مکروہ جانتے ہیں اور ان روزوں کے بارے میں بدعت کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ رمضان کے ساتھ وہ چیز نہ ملادی جائے جو اس کی نہیں ہے۔ جاہل لوگ اگر اہل علم کے ہاں ان روزوں کے بارے میں رخصت اور اس پر عمل کا مشاہدہ کریں گے تو وہ ان کو رمضان کا حصہ بنادیں گے۔ امام مالک کہتے تھے کہ میں نے اہل علم، فقہاء اور ان لوگوں سے جن کی اقتدا کی جاتی ہے، نہیں سنا کہ انہوں نے جمعہ کے دن کے روزہ سے روکا ہو۔ اس دن کا روزہ رکھنا اچھا ہے۔ میں نے بعض اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ جمعہ کا روزہ رکھتے تھے اور اس کا اہتمام کرتے تھے۔

اہل علم سے مراد مدینہ کے علماء و فقہاء ہیں۔ ان کے عمل کی روشنی میں امام صاحب نے یہ فتوے دیے ہیں۔ بعض جاہل لوگ روزہ میں مسواک کرنے سے بہت روکتے ہیں لیکن اہل علم میں سے کسی نے اس کو مکروہ نہیں سمجھا۔

اسی طرح بعض لوگ شوال کے چھ روزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ امام مالک کے اہل علم تابعین و تبع تابعین ہیں وہ ان پر بدعت کا حکم لگاتے رہے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر شوال کے چھ روزے رکھنے کی رسم اہل علم میں چل پڑی تو اہل بدعت اس کو دلیل بنا کر ان روزوں کو رمضان کے روزے کے ہم پلہ قرار دے لیں گے۔

ان فتووں میں امام مالکؒ نے بعض ان غلط فہمیوں کو رفع کیا ہے جو آج بھی عوام و خواص میں پائی جاتی ہیں۔

خالد مسعود

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آغاز

جب کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ اس قوم کو مخاطب کر کے اللہ کا پیغام پہنچانے پر مامور ہوتا ہے تاکہ لوگ اپنے غلط عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر اللہ کے بندے بن جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کی فطری نیکی کو ابھارتا، غلط کاموں پر متنبہ کرتا، نصیحت و موعظت کے ذریعے ان کو خدا کی بتائی ہوئی راہ راست کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا اور قوم کی فکری و عملی رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کام خفیہ کرنے کا نہیں ہوتا۔ رسول کی ذمہ داری کی نوعیت سازش کر کے انقلاب برپا کرنے کی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھے اور اپنی جماعت کھڑی کر کے ایسا افراد مہیا کرے جو قوم کے اندر رائج نظام کو تلپٹ کر کے اس کے تجویز کردہ نظام کو نافذ کردیں۔ رسول کے کام کی نوعیت ہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ اس بات کا آرزو مند ہو کہ ساری قوم اس کی آواز پر لبیک کہہ دے لیکن عملاً اس کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہوتی کہ اس کا ساتھ دینے والے کون اور کس حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کل کتنے تھے اور آج انکی تعداد کیا ہے۔ چنانچہ بعض رسولوں پر ایمان لانے والے چند ہی افراد ہوئے، باقی ساری قوم نے ان کا انکار کیا، تاہم رسول اپنا فریضہ ادا کرنے میں کامران ہوئے۔

رسول دین کی دعوت اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری مالک ارض و سماء اس کے سپرد کرتا ہے۔ چنانچہ وہی اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں وہی اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ لہٰذا رسول کو کسی بھی مرحلہ پر اپنی قوم کے کسی سخت ردعمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دعوت خفیہ رکھنے پر مجبور ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ان کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا جس میں ان کے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ چونکہ فرعون کو بنی اسرائیل سے بیر تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو اس قتل کا ذمہ دار گردانا گیا۔ موسیٰ مصر چھوڑ کر مدین چلے گئے۔ سالوں کے بعد وہاں سے لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی ان کو حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر میرا پیغام پہنچاؤ، وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کوئی خفیہ پلان تیار نہیں کیا بلکہ بے دھڑک فرعون کے پاس چلے گئے۔ فرعون نے ان کے پچھلے جرم کا حوالہ دیا اور یہ امکان بھی تھا کہ وہ ان کو گرفتار کر لے مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا:

لا تخافا انني معکما اسمع و اری

(تم دونوں (یعنی موسیٰ وہارون علیہما السلام) اندیشہ مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں)

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ جیسے عظیم المرتبت خاتم الانبیاء کے بارے میں آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تاثر کیسے پھیلا دیا اور امت نے اس کو قبول کیسے کر لیا، کہ تین سالوں تک آپ نے خفیہ تبلیغ کی۔ یہ بات رسولوں کی سنت سے مطابقت نہیں رکھتی اور حقائق کے بھی منافی ہے۔ اگر آپ نے قریش کی مخالفت کے خوف سے ایسا کیا تو کیا اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت آپ کو حاصل نہ تھی جو تمام رسولوں کو حاصل رہی ہے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تین سالوں کے بعد جب آپ نے اعلانیہ تبلیغ شروع کی تو کیا اس وقت قریش کی عداوت ختم ہو چکی تھی؟ اگر آنحضرت ﷺ نے اس عرصہ میں دعوت کو عام لوگوں کے علم میں لانے میں رکاوٹ پیدا کی تو یہ ایک ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی تھی جو حضور کی عظمت و شان کے منافی ہے۔ خفیہ تبلیغ کی کوئی اور حکمت سیرت نگار بیان نہیں کرتے۔ لہذا ہمارے نزدیک آپ کی جدو جہد کا کوئی دور خفیہ نہیں رہا۔

رسول اللہ ﷺ نے کام کا آغاز بالکل فطری انداز میں کیا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی نئی ذمہ داری سے اپنی اہلیہ محترمہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، کو آگاہ کیا جو پہلے ہی سے آپ کے عقیدہ و عمل کی مداح، اور آپ کی رسالت کی خبر کی منتظر تھیں، انہوں نے فی الفور آپ کی دعوت قبول کی۔ اس کے بعد یہ بات آپ کے باقی اہل خانہ کے علم میں آئی۔ ان میں سے آپ کی بیٹیوں زینبؓ اور رقیہؓ اور آزاد کردہ غلام و متبنی زیدؓ بن حارثہ (جنہوں نے آزاد ہو کر اپنے والد کے ساتھ بنو کلب جانے پر آنحضرت کی غلامی کو ترجیح دی تھی) نے اسلام قبول کیا۔ حضور کی تیسری صاحبزادی ام کلثومؓ ابھی کم سن تھیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی اور حضرت علیؓ، جو آنحضرتؐ کی تولیت میں تھے، صرف آٹھ سال کے تھے اور ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ بہر حال یہ صاحبزادیاں اور حضرت علیؓ اسلام ہی کی آغوش میں پلے بڑھے اور سن شعور کو پہنچ کر انہوں نے اسلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔

گھر سے باہر آنحضرت ﷺ کے دوستوں، قدر دانوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آپ نے ان پر توجہ دی۔ جوں جوں وہ اسلام کی تعلیم کے قائل ہوتے گئے، نہ صرف خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ اپنے اپنے اہل خانہ یا دوستوں کو بھی اس دین میں لانے کا ذریعہ بنے۔ ان کا تعلق قریش کے سبھی خاندانوں سے تھا۔ اس کا اندازہ سابقون اولون (یعنی شروع ہی میں ایمان لانے والوں) کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جو تمام سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ ہم قریش کے خاندانوں کے حوالہ سے اسے یہاں نقل

کرتے ہیں:۔

بنو ہاشم:	جعفرؓ بن ابی طالب مع زوجہ اسماءؓ بنت عمیس	
بنو مطلب:	عبیدہؓ بن الحارث	
بنو عبد شمس:	عثمانؓ بن عفان	
	خالدؓ بن سعید بن العاص	
	سلیطؓ بن عمرو	
	ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ	
بنو اسد:	زبیرؓ بن العوام	
	خدیجہؓ بنت خویلد	زوجہ رسول اللہ
بنو مخزوم:	ابو سلمہؓ بن عبد الاسد	
	عیاشؓ بن ابی ربیعہ	مع اسماءؓ بنت سلامہ
	ارقم بن عبد مناف	
بنو تیم:	عبد اللہ بن ابی قحافہ	(حضرت ابو بکرؓ)
	طلحہؓ بن عبید اللہ	
	اسماءؓ بنت ابی بکر	(حضرت عائشہؓ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچی تھیں)
بنو زہرہ:	عبد الرحمٰنؓ بن عوف	
	سعدؓ بن ابی وقاص	وعمیرؓ بن ابی وقاص
	خبابؓ بن الارت	(حلیف)
	عبد اللہؓ بن مسعود	(حلیف)
بنو عدی:	سعیدؓ بن زید	مع زوجہ فاطمہؓ بنت خطاب
بنو جمح:	عثمانؓ بن مظعون و قدامہؓ بن مظعون و عبد اللہؓ بن مظعون	
بنو سہم:	خنیسؓ بن حذافہ	
بنو اسد بن خزیمہ:	عبد اللہؓ بن جحش و ابو احمدؓ بن جحش و زینبؓ بنت جحش	
بنو حارث:	ابو عبیدہؓ بن الجراح	

ان کے علاوہ غلاموں میں عمارؓ بن یاسر، یاسر مع زوجہ سمیہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور صہیبؓ بن سنان

کے نام قدیم الاسلام صحابہ کے طور پر آتے ہیں۔ سیرت کی قدیم ترین کتابوں کے مطابق نبوت کے پانچویں سال تک مسلمانوں کی تعداد سوا سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی میں قریش کے تمام خاندانوں کے اچھے افراد کو متاثر کر کے ان کے دلوں کو جیت لینے والی دعوت کیا خفیہ تھی اور اتنے لوگوں کا اسلام کیا مخفی رہ سکتا تھا کہ قریش کی لیڈر شپ کو تین سالوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی ہو کہ وہ اس آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی تدبیر کر سکتے۔

دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو قریش کے خانوادے کوئی الگ الگ جزیرے نہ تھے کہ بنوہاشم میں پیش آنے والا ایک واقعہ بنوامیہ یا بنواسد یا بنومخزوم کے علم میں نہ آ سکتا۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آنحضرت کی پھوپھی ام الحکیم بیضاء بنوامیہ میں، پھوپھی صفیہ بنواسد میں، پھوپھی برہ بنومخزوم میں اور پھوپھی امیمہ بنواسد بن خزیمہ میں بیاہی ہوئی تھیں، عثمانؓ بن عفان بیضاء کے نواسے، زبیر بن العوام حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور صفیہ کے بیٹے تھے۔ جحش کے صاحبزادے امیمہ کی اولاد اور ابوسلمہ برہ کے بیٹے تھے۔ بنوزہرہ آنحضرتؐ کے ننھیال اور بنواسد آپ کے سسرال تھے۔ اتنی قریبی رشتہ داریوں میں باہمی تعلقات بے تکلف ہوتے ہیں، تمام لوگ ایک دوسرے کے احوال سے باخبر ہوتے ہیں اور کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خفیہ نہیں رہ سکتا۔ آخر رسول اللہ ﷺ کی دعوت ہی تین سال تک کیسے خفیہ رہ گئی۔

ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ قریش کی لیڈر شپ کی نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی اور لوگوں کے قبول اسلام کی رفتار بالکل فطری تھی۔ لوگ آنحضرت ﷺ سے ملتے، آپ کا نقطہ نظر معلوم کرتے اور جیسے جیسے دعوت کے معاملہ میں یکسو ہوتے، قبول اسلام کی راہ میں کوئی چیز سد راہ نہیں بنتی تھی۔ آغاز کار میں بوجوہ قریش کے لیڈروں نے حضور کی مخالفت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس لیے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ آنحضرتؐ کی دعوت کا خفیہ دور تھا۔ قریش کے اس رویہ کے بظاہر تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

اولاً: اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنے رسول پر ایک تدریج کے ساتھ نازل ہوا۔ ابتدا میں اس کا ہدف دلوں کے اندر نیکی کے فطری داعیہ کو ابھارنا اور معاشرتی برائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا۔ اس میں خدا سے شکر گزاری کے تعلق، بندوں کے حقوق کے شعور، غرباء پروری، مسکینوں کی دستگیری، یتیموں پر شفقت اور مکارم اخلاق کو تعلیم کا مرکزی نقطہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ آیات ملاحظہ ہوں:

''انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خداوند اس کا امتحان کرتا اور اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے اور

جب وہ اس کو جانچتا اور رزق میں کمی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے خداوند نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے، مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے، وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے اور مال کے عشق میں متوالے ہو''۔ (الفجر: ۱۶۔۲۰)

''کیا ہم نے (انسان) کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں: پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانہ میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی''۔ (البلد: ۸۔۱۷)

''تمہاری سرگرمی کے ثمرات الگ الگ ہیں۔ سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے''۔ (اللیل: ۴۔۱۰)

تمام اچھے اہل عرب ان اعلیٰ مقاصد کے ہمیشہ سے خوگر تھے جن کی تعلیم قرآن دے رہا تھا۔ اس تعلیم سے شرفائے قریش کے دلوں میں کوئی کھٹک نہیں پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس دعوت کو ایک مقبول و ہر دلعزیز مصلح کی ایک قابل قدر سرگرمی قرار دیا۔

ثانیاً: قریش کے اندر دین حنیف کے ماننے والوں کی ایک روایت پہلے سے موجود تھی۔ ان لوگوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہ رہی ہو لیکن یہ لوگ عین خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے اور معاشرہ ان لوگوں کو برداشت کرتا تھا۔ نبی ﷺ حنیف تو تھے ہی، آپ معاشرے کے سب سے زیادہ باکردار، مکارم اخلاق کا پیکر، حسن عمل کا نمونہ، مجسم صداقت و امانت اور حق نصیحت ادا کرنے والے بھی تھے۔ قوم آپ کی قدردان اور آپ پر اعتماد کرتی تھی۔ آپ نے دین کی دعوت دینا شروع کی تو وہ آپ کے اسی کردار کو مزید نمایاں کرنے والی تھی۔ لہٰذا قریش کو ابتدا میں اس دعوت سے کوئی وحشت نہیں ہوئی۔ یہ اسی طرح کی صورت حال تھی جیسے حضرت ابراہیم اپنے والد اور قوم کو بتوں کی پوجا سے منع کرتے رہے تو قوم ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے بتوں کو توڑ ڈالا اور بتوں کے پجاریوں نے قیاس آرائی شروع کی کہ یہ کارروائی کس شخص کی ہو سکتی ہے تو انہوں نے یقین کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام

کا نام نہیں لیا بلکہ محض گمان کا اظہار کرتے ہوئے کہا: **سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم**

(ایک نوجوان کو، جس کا نام ابراہیم ہے، ہم نے ان بتوں کا (برا) ذکر کرتے سنا ہے)

یعنی یہ شخص چونکہ بتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مخالفانہ انداز میں کرتا رہا ہے لہٰذا ممکن ہے اسی نے یہ حرکت کی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے جب وہ تقاضے سامنے آئے جن کی زد قریش کے مفادات پر پڑتی تھی اور انہیں اپنے مذہبی نظام میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ محسوس ہوا تب انہوں نے نبی ﷺ اور آپ کی دعوت کے معاملہ میں رویہ تبدیل کیا۔

ثالثاً: عربوں کی زندگی قبائلی تھی۔ ہر خاندان اپنے افراد کا بہی خواہ اور محافظ ہوتا تھا۔ دوسرے قبائل اور خاندانوں کے لوگ کسی غیر خاندان کے فرد کو نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے کہ اس فرد کے خاندان کے جذبۂ انتقام کو کیسے ٹھنڈا کریں گے اور ان کے نقصان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔ قریش کے اندر جب اسلام قبول کرنے والوں پر تشدد کرنے اور دعوت دین کو زور و قوت سے کچل دینے کا خیال پیدا ہوا تو بار بار یہی سوال سامنے آتا رہا کہ متاثرین کے خاندانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی کسی میں ہے یا نہیں۔ عرب قبائل میں اپنے افراد کا ساتھ دینے اور ان کے ساتھ زیادتی کا انتقام لینے کی روایت اس قدر مستحکم تھی کہ بعد میں جب یثرب کے قبائل اوس اور خزرج نے اسلام قبول کیا اور آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاں لے جانے کی پیشکش کی تو اس سے پہلے آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ ان قبائل کے ان افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جو یہودیت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضور نے ان یہودیوں کے وہی حقوق تسلیم کیے جو اسلام لانے والوں کے تسلیم کیے۔

مسلمانوں پر تشدد کا دور:

ابتدائی پرسکون دور کے بعد قریش کے اکابر نے دیکھا کہ محمد (ﷺ) جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ بے حد متاثر کرنے والا ہے۔ وہ لسانی طور پر پرکشش ہے اور اس میں عقل کے لیے بھی اپیل ہے۔ یہ کلام نت نئے تقاضے اور مطالبے سامنے لا رہا ہے اور اب اس نے مشرکانہ نظام زندگی کی بنیادوں پر تیشہ چلانا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی تعلیم کو قبول کر رہے تھے اس لیے انہیں اپنے خلاف عام بغاوت پیدا ہو جانے کا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کو روکنے کی فوری تدبیر یہی اختیار کی جا سکتی تھی کہ اسلام قبول کرنے والوں پر سختی کر کے ان کے لیے زندگی گزارنا اجیرن کر دیا جائے۔ اس میں بڑی رکاوٹ قبائلی نظام تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے خاندان کے فرد پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا

یہ فیصلہ ہوا کہ ہر خاندان اپنے افراد پر خود ہی ہاتھ ڈالے۔ اس میں بھی نظام کا پہلا ہدف غلاموں اور لونڈیوں کو بنایا گیا۔ سیرت کی کتابوں میں یاسر، ان کی بیوی سمیہ، عمار بن یاسر، بلال، خباب، عامر بن فہیرہ، ابوفکیہ، لبینہ، زنیرہ رضوان اللہ علیہم پر تشدد کے واقعات پڑھیے تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کو بھوکے پیاسے رکھنا، دھوپ میں گھنٹوں کھڑا رہنے پر مجبور کرنا، گرم ریت پر لٹانا، زدوکوب کرنا ایک معمول کی کارروائی تھی۔ لیکن دلوں میں ایمان کی جو شمع روشن ہو چکی تھی وہ اس ظلم سے بجھنے نہیں پائی۔ حضرت یاسرؓ اور ان کی زوجہ سمیہؓ نے جام شہادت نوش کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے متعدد غلاموں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کر کے ان کو ظلم و ستم سے نجات دلائی۔

سابقون اولون کی عمروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر نوجوان طبقہ آنحضرتؐ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ بعثت کے وقت حضور کی اپنی عمر چالیس برس تھی۔ ابوبکر صدیقؓ آپ سے تین سال چھوٹے تھے لیکن مسلمانوں کے بڑے بوڑھے کہلاتے تھے۔ گویا باقی مسلمانوں کی عمریں ان سے کم تھیں۔ زیادہ قرشی نوجوان بیس یا تیس کے پیٹے میں تھے۔ اکابرین قریش نے جب سربراہان خاندان کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے ان نوجوانوں کو قابو میں لائیں جو محمد (ﷺ) کا ساتھ دے رہے ہیں تو ظلم و تشدد کے دھارے کا رخ ان نوجوانوں کی طرف بھی مڑا۔ تاریخ میں عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن عوام، مصعب بن عمیرؓ، خالدؓ بن سعید وغیرہ کے نام محفوظ ہیں۔ ان کو اتنی ایذائیں دی گئیں کہ معاملہ ان کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ یہی حال باقی مسلمانوں کا تھا۔ ابوبکر صدیقؓ جیسے فرزانہ، ہمدرد و ہم گسار شخص کو بھی نہ بخشا گیا۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق انہوں نے بھی راہ خدا میں زخم کھایا۔

مسلمانوں کے لیے ان حالات کا مقابلہ طاقت سے کرنا ممکن نہ تھا۔ کوئی چیز اگر ان کا حوصلہ قائم رکھ سکتی تھی تو وہ اللہ پر توکل، دین پر ثابت قدمی کے اچھے انجام اور آخرت کی کامرانی کا یقین تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے متعدد آیات قرآنی نازل ہوئیں۔ بنی اسرائیل کے ان نوجوانوں کا حوالہ دیا گیا جو فرعون کے تشدد کے اندیشہ کے باوجود حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے بنے۔ انہوں نے جب اپنے رسول سے فرعونوں کے ظلم کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ان کو اللہ پر بھروسہ کرنے اور اسی سے مدد مانگنے کی ہدایت کی۔ فرمایا:

> ''موسیٰ کی بات نہ مانی مگر اس کی قوم کے تھوڑے سے نوجوانوں نے، فرعون اور اپنے بڑوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے۔ بے شک فرعون ملک میں نہایت سرکش اور حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔ اور موسیٰ

نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر چکے ہو۔ وہ بولے کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کے ظلم کا آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجہ ستم سے چھڑا۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرالو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو''۔ (یونس: ۸۳۔۸۷)

معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے لیے بعض گھر مخصوص کر لینے کی اسی ہدایت کی روشنی میں نبی ﷺ نے حضرت ارقم بن عبد مناف کے گھر کا انتخاب فرمایا جہاں مسلمان جمع ہوتے، نماز باجماعت ادا کرتے، قرآن سیکھتے اور آنحضرت کی نصیحت و موعظت سے حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت حاصل کرتے۔ اس طرح دار ارقم اہل ایمان کی تعلیم و تربیت کا مکہ میں پہلا مرکز بن گیا۔

دار ارقم کے انتخاب کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ بیت اللہ سے کوہ صفا کی طرف یعنی جانب جنوب میں تھا۔ اس گھر میں نماز پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ (ابراہیمی قبلہ) اور بیت المقدس (اہل کتاب کا قبلہ) دونوں کو قبلہ بنانا ممکن تھا۔ حضور کا طریقہ مسجد حرام کے اندر بھی یہی تھا کہ آپ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان کی دیوار کو سامنے رکھ کر نماز ادا کرتے تھے تا کہ دونوں قبلے جمع ہو جائیں۔

دوسرے موقع پر قرآن کا ارشاد یوں ہے:

''ہلاک ہوئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے، جب کہ وہ اس پر بیٹھے ہوں گے اور جو کچھ وہ اہل ایمان سے کرتے رہے اس کو دیکھیں گے، اور انہوں نے ان پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ ایمان لائے اس خدائے عزیز و حمید پر، جس کی ہی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے لازماً جہنم کی سزا اور جلنے کا عذاب ہے''۔ (البروج: ۴۔۱۰)

جب نوجوانوں کو ان کے کافر باپوں یا رشتہ داروں نے سختیاں کر کے محمد (ﷺ) کا دین چھوڑنے پر مجبور کیا تو اس صورت حال میں قرآن نے ان کو واضح ہدایات دیں کہ اللہ نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت ضرور کی ہے لیکن والدین کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اولاد کو اللہ کے شریک ماننے پر مجبور کریں۔ اس معاملہ میں ان کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ یہ بزرگان خاندان یہ بھی

کہتے کہ ہم لوگ تم نوجوانوں سے زیادہ خیر و شر اور نیک و بد کو سمجھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقہ پر چلتے رہو۔ اگر یہ طریقہ غلط ہوا تو اللہ کے ہاں تمہارے اس گناہ کا بوجھ ہم اٹھالیں گے۔ ان کو بتایا کہ خدا کے ہاں کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا۔ فرمایا:

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے، تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو میں اس سے تمہیں آگاہ کروں گا۔ اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے''۔ (عنکبوت: ۸۔۹)

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں بنیں گے۔ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ وہ اپنے گناہ لادے ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور جو افترا وہ کر رہے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پرسش ہونی ہے''۔

(عنکبوت: ۱۲۔۱۳)

اسلام قبول کرنے والے قریش کے ہاتھوں ظلم ہی نہیں سہہ رہے تھے بلکہ قریش کے دوسرے گھٹیا ہتھکنڈوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ ان میں جو لوگ تجارت پیشہ تھے ان سے لین دین نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ جو لوگ محنت مزدوری کرتے تھے ان کو ان کا حق خدمت دینے میں لیت و لعل سے کام لیا جاتا۔ مثال کے طور پر حضرت خبابؓ نیزے بھالے بنانے کا کام کرتے تھے۔ قریشی لیڈر عاص بن وائل کے ذمہ ان کی مصنوعات کی قیمت نکلتی تھی۔ عاص نے ان کی ادائیگی روک لی۔ خبابؓ اس کے پاس تقاضا کرنے گئے تو وہ کہنے لگا کہ جب تک محمد کا انکار نہیں کرو گے اس وقت تک میں کچھ نہیں دوں گا۔ خبابؓ نے جواب دیا، جب تک اللہ تجھے موت نہ دے دے یہ کام تو میں کرنے کا نہیں۔ بلکہ اس وقت تک بھی نہیں کروں گا جب مرنے کے بعد تمہارے جی اٹھنے کا وقت آئے گا۔ وہ بولا، ٹھیک ہے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ میں مر جاؤں، پھر اٹھایا جاؤں، پھر مجھے مال و اولاد ملے۔ جب ایسا ہوگا تو میں تیرا قرض ادا کر دوں گا۔
(صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب ذکر القین والحداد)

انذار قریش کا حکم:

قرآن میں نبی ﷺ کو یہ ہدایت ملی کہ انذر عشیرتک الاقربین (اپنے قرابت مند خاندان کو انذار کرو) انذار کا مطلب یہ تھا کہ ان کو خبردار کرو کہ وہ اپنی حرکتوں کو چھوڑ کر اسلام کی تعلیم کو قبول کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے لیے تیار رہیں، جس سے چھڑانے والا اور اللہ کے عذاب سے پناہ دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ قرابت مند خاندان سے مراد بنو ہاشم اور وہ تمام خاندان تھے جن کا تعلق خانہ کعبہ کے نظم و نسق، اس کی حفاظت و خدمت اور مذہبی رسوم ادا کروانے سے تھا۔ انذار کی ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے گھر کے یہ متولی اور ناظمین اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کر کے دوسرے عربوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کھولیں کیونکہ دین کے معاملہ میں یہ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ اگر یہ طبقہ کسی طرح دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دوسرے لوگ بہ آسانی ان کی پیروی میں دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جب تک یہ طبقہ دعوت کو قبول نہ کرے تو یہ عوام الناس کو اپنے مشوروں اور نصیحتوں کے ذریعے دعوت کی مخالفت اور بیخ کنی پر اکساتا رہتا ہے۔

یاد رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ اللہ واحد کی عبادت کے مرکز کے طور پر بنایا تھا اور اپنی اولاد کو اس میں نماز، طواف، اعتکاف، حج اور قربانی کی سہولتیں مہیا کرنے اور زائرین کی خدمت کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اولاد ابراہیم بیت اللہ کے اندر شرک کو تحفظ دینے اور توحید کی آواز دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ کے چچا ابولہب نے خانہ کعبہ کے چڑھاووں کو ذاتی ملکیت میں لے کر اپنے گھر میں ایک بڑا خزانہ جمع کر لیا تھا۔ اگر یہ لوگ حضور کی دعوت کو قبول کر لیتے تو بیت اللہ کے نظام کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنا ممکن ہوتا جس کی آرزو ابراہیمؑ نے کی تھی اور جس کے لیے درد دل کے ساتھ دعائیں کی تھیں۔

قرآن کی مذکورہ ہدایت پر عمل کرنے کے لیے نبی ﷺ نے عربوں میں مروج طریقہ اپنایا۔ ان کے ہاں یہ روایت تھی کہ اپنے دشمنوں کی غارت گری سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اپنی بستی کے قریب کسی ٹیلہ پر ایک دیدبان مقرر کر دیتے جو چاروں طرف نگاہ رکھتا۔ اگر دیدبان کبھی خطرہ محسوس کرتا تو 'یا صباحاہ' کا نعرہ بلند کرتا جس کا مطلب ہوتا کہ غارت گری کا خطرہ ہے۔ لوگ آواز سنتے ہی گھروں سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آتے اور خطرہ کی نوعیت پوچھتے۔ اگر حملہ ہونے والا ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آ جاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک صبح کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہی نعرہ لگایا تو لوگوں نے

حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ نعرہ کون لگا رہا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ محمد (ﷺ) کی آواز ہے تو قریش کے عام و خاص صفا کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں ایک نذیر (یعنی خطرہ سے خبردار کرنے والا) ہوں۔ میری اور تم لوگوں کی مثال اس آدمی کی ہے جو دشمن کو دیکھ کر اپنے قبیلہ کی دیدبانی کرتا ہے۔ پھر جب ڈرتا ہے کہ دشمن کہیں ان تک پہنچ نہ جائے تو 'یا صباحاہ' کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ میں ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے بنو کعب بن لوی، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد شمس، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے ہاں تمہارے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ تمہارے ساتھ میرا رحمی رشتہ ہے، سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ اس موقع پر واحد آواز جو آپ کے خلاف اٹھی وہ ابولہب کی تھی جس نے کہا تبالک الھذا دعوتنا (غارت ہو، کیا اسی لیے تم نے ہمیں بلایا تھا؟)

دوبارہ آپ نے انذار کی ہدایت پر عمل کرنے کی یہ تدبیر اختیار کی کہ تمام قرابت داروں کو کھانے پر بلایا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے ان سے خطاب کر کے اپنی دعوت پیش کرنا چاہی لیکن ابولہب آپ کی تقریر میں مخل ہو گیا اور لوگوں سے کہا کہ اب یہ شخص تم پر اپنا جادو چلانا چاہتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی منتشر ہو گئے۔ اس طرح حضور کو دعوت پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم نبی ﷺ نے برملا انذار کے مضمون کو عوام میں بیان کرنا شروع کر دیا جس سے قریش چیں بجبیں ہوئے۔

جب رسول اللہؐ نے شرک کے خلاف قرآن کا یہ موقف پیش کیا کہ یہ ایک من گھڑت نظام ہے جس کی کوئی گنجائش دین ابراہیمی میں ہے اور نہ اس کے حق میں کوئی عقلی دلیل ہے۔ یہ گمراہی پچھلے دور کے لوگوں نے بے دلیل اختیار کر لی تو قریش کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ ان کے خیال میں اگر یہ تصور عوام الناس میں پھیل جاتا تو ان کے اقتدار کی ساری عمارت زمین بوس ہو سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے آنحضرتؐ کے معاملہ میں مزید خاموشی کو خلاف مصلحت سمجھا اور آپ کی راہ روکنے کے لیے مؤثر طریقے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اشراف قریش کا ایک وفد بنو ہاشم کے سردار ابوطالب کے پاس گیا اور شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا

ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب کو غلط قرار دیتا ہے، ہمارے آباء و اجداد کو گمراہ سمجھتا ہے اور اپنے اس خیال کا برملا اظہار کرنے لگا ہے۔ اب یا تو آپ اس کو ایسا کرنے سے باز رکھیں یا اس کے اور ہمارے درمیان میں سے نکل جائیں تاکہ ہم خود اس سے نمٹ لیں۔ ابوطالب نے نرمی سے ان کو ٹھنڈا کیا اور خوش اسلوبی سے معاملہ کو ٹال دیا۔

جب حضور کی دعوت اسی طرح زور و شور سے جاری رہی تو اشراف قریش دوبارہ وفد کی صورت میں ابوطالب کے پاس پہنچے اور اب یہ دھمکی دی کہ اگر آپ نے بھتیجے کو نہ روکا تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کی اور اس کی رائے ایک ہی ہے اور یہ چیز ہمارے درمیان لڑائی کا باعث بن جائے گی۔ ابوطالب کو اس الٹی میٹم سے سخت فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے رسول اللہ کو بلا بھیجا اور کہا کہ بھتیجے! اپنے اوپر اور میرے اوپر رحم کرو۔ مجھ پر اتنا بوجھ مت ڈالو جس کو میں برداشت نہ کرسکوں۔ آنحضرت ﷺ نے اندازہ لگایا کہ چچا شاید اب میرا ساتھ چھوڑ جائیں کیونکہ ان کی باتوں سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا، چچا جان! اگر یہ لوگ اس شرط پر کہ میں یہ کام چھوڑ دوں، میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں، تو میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ مجھے غلبہ عطا فرمائے گا یا میں اس جدوجہد میں ختم ہو جاؤں گا۔ ابوطالب نے حضور کا جب یہ عزم دیکھا تو کہا، بھتیجے! جاؤ جو تبلیغ چاہو کرو۔ میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔

قریش نے ابوطالب کو یہ پیشکش بھی کی کہ آدمی کے بدلے آدمی لے کر تصفیہ کرلیں اور محمد (ﷺ) کو ان کے حوالہ کردیں۔ مطعم بن عدی، جو عبد مناف ہی کے خاندان بنو نوفل سے تھا، اس تجویز پر قریش کا ہم نوا ہو گیا۔ ابوطالب کو یہ تجویز ہتک آمیز لگی کہ بنو ہاشم کا بہترین فرد قریش کے حوالہ کر دیا جائے کہ وہ اس کو قتل کرسکیں، لہٰذا انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس سے بنو عبد مناف بھی تقسیم ہو گئے۔ صرف بنو ہاشم (سوائے ابولہب کے) اور بنو مطلب رسول اللہؐ کے ساتھ رہ گئے۔

محبوب سبحانی

شفاعت کا صحیح اور غلط تصور

آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا میں برائی کا راستہ اختیار کرنے میں جہاں دوسرے عوامل کا دخل ہے وہاں شفاعت کے غلط عقیدہ کا بھی ہے۔ مشرک قوموں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ جن بتوں، دیویوں، دیوتاؤں یا جنوں کی عبادت کرتے ہیں وہ خدا کے چہیتے ہیں، اگر آخرت کا کوئی دن ہوا اور خدا کے حضور اعمال کا حساب دینا پڑ گیا تو ہم اپنے دیوی دیوتاؤں کی سفارش پر چھوٹ جائیں گے اور ٹھنڈے ٹھنڈے جنت میں جا براجیں گے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے ہاں بھی ایسا ہی عقیدہ پایا جاتا ہے جو ان کی گمراہی کا سبب بنا ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہم حضورؐ کی امت ہیں، اس لیے قیامت کے دن ہمیں حضور کی شفاعت لازماً نصیب ہوگی لہٰذا ہم جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ اسی طرح یہ عقیدہ بھی پایا جاتا ہے کہ ہمارے بزرگ اور پیر صاحب ہمیں قیامت کے دن چھڑا لیں گے۔ اس عقیدہ کی بنیاد اس خیال پر مبنی ہے کہ بعض شرکاء کو خدا کے ہاں اعتماد اور ناز کا درجہ حاصل ہے کہ وہ کسی کے لیے خود بڑھ کر خدا سے سفارش کر سکتے ہیں اور خدا ان کی ناز برداری میں لازماً ان کی سفارش قبول فرمائے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سفارش عدل کے سراسر خلاف ہے۔ دنیا میں ہم ان ہی سفارشوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں کیونکہ سفارش عام طور پر نااہل شخص کے لیے کی جاتی ہے جس سے اہل شخص کا حق مارا جاتا ہے۔ اس تصور کا یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ سفارش ماننے والے کے نزدیک اہل اور نااہل دونوں برابر ہیں۔ اپنے ذاتی کاروبار اور معاملات میں لوگ اس قسم کی کسی سفارش کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سے کاروبار کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن خدا کے معاملہ میں اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ خدا کو اتنا بھی عقل مند نہیں سمجھتے کہ جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ درحقیقت قیامت کامل عدل کے ظہور کا دن ہے۔ اس روز ہر شخص کا بے لاگ حساب کتاب ہوگا اور ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اس کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور جس کی برائیوں کا پلڑا بھاری ہوگا اس کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ مزید براں علیم و خبیر اللہ تعالیٰ کے سامنے وہی شخص سفارش کرسکتا ہے جس کی معلومات خدا سے زیادہ ہوں اور وہ کہہ سکے کہ اللہ میاں! آپ کو نہیں معلوم لیکن میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بڑا نیک شخص رہا ہے اس لیے تو اس کو بخش دے۔ گویا شفاعت کے تصور کے تحت سفارشی اللہ تعالیٰ کے علم کو محیط کل نہیں مانتا حالانکہ ایسا شخص تو خود سزا کا مستحق ہوگا۔ یہ کائنات ایک پرحکمت کائنات ہے۔ اس کے گوشہ

گوشہ سے اور اللہ تعالیٰ کے ہر کام سے حکمت ظاہر ہو رہی ہے۔ اس لیے اگر کسی کی سفارش پر برے آدمی کو جنت میں بھیج دیا جائے تو یہ ایک غیر حکیمانہ کام ہوگا اور یہ خدا کے عدل و حکمت کی صریح نفی ہوگی۔

شفاعت باطل کا یہ عقیدہ آخرت کی باز پرس سے فرار کے لیے ایک چور دروازہ ہے۔ آخرت کے ماننے سے انسان پر بہت بھاری ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں اس وجہ سے جو لوگ ان ذمہ داریوں سے گریز کرنا چاہتے ہیں وہ شرک و شفاعت کی آڑ لیتے ہیں۔ وہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں نہ اپنے نفس کی خواہشوں پر کوئی پابندی ہی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے اول تو وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں، اور اگر مانتے ہیں تو شفاعت کا عقیدہ ایجاد کر کے اس کے تمام خطرات سے، اپنے زعم کے مطابق، وہ اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کا سارا اعتماد اپنے مزعومہ شفعاء کی شفاعت پر ہوتا ہے۔ شفاعت باطل کے اس عقیدہ کی قرآن مجید نے جگہ جگہ تردید کی ہے۔ مثلاً قیامت کے دن کے بارے میں فرمایا:

يوم "لَا بَيع" فِيهِ وَلَا خُلَّة" وَلَا شَفَاعَة"

(وہ دن جس میں نہ سودا بازی ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ شفاعت)

دوسرے مقام پر کفار کے بارے میں بتایا کہ وہ آخرت کی حقیقت کے مشاہدہ کے متمنی ہیں۔ اس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی، وہ لوگ جنہوں نے اس کو پہلے نظر انداز کیے رکھا، بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں، یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے"۔ (اعراف: ۵۳)

فما تنفعهم شفاعة الشّفعين (مدثر: ۴۸)

"تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی"

یعنی قیامت کے دن مشرکین کے مزعومہ شفعاء ہوں گے نہ ان کی شفاعت ہوگی۔ یہاں صاف صاف کہہ دیا کہ مشرکین نے جو دیوی دیوتا گھڑ رکھے ہیں اور جن کو اپنا سفارشی تصور کرتے ہیں روز آخرت تو ان کا وجود

تک نہ ہوگا چہ جائیکہ وہ اپنے پرستاروں کی سفارش کریں گے۔

ملائکہ کی حیثیت کا غلط تصور:

اہل عرب کے ہاں سفارش کرنے والوں میں ملائکہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ فرشتوں کی شفاعت پر اعتماد کرنے والوں کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں جن کو خدا کے دربار میں بڑی رسائی حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی ناز برداری میں ان کی کوئی بات رد نہیں کرے گا۔ اس لیے دنیا میں ان کی پرستش کی جائے تاکہ قیامت کے دن ان کی شفاعت کام آئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے نزدیک کسی شخص کو جنت یا دوزخ میں بھیجنے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے بجائے فرشتے کریں گے۔ یعنی کوئی برا آدمی دنیا میں ملائکہ کی عبادت کرتا رہا ہو تو قیامت کے روز فرشتے اس کو جنت میں داخل کرا دیں، اور کوئی نیک آدمی خدائے واحد کی عبادت تو کرتا ہو لیکن فرشتوں کی پرستش نہ کرتا رہا ہو تو فرشتے ناراض ہو کر اس کو دوزخ میں بھجوا دیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے کامل عدل و انصاف کے خلاف ہے بلکہ یہ اس کے عدل کا مذاق اڑانے کے بھی مترادف ہے۔

مزید براں اللہ تعالیٰ کی اولاد ہونا قابل فہم بات نہیں ہے۔ یہ ماننے کے بعد تو نعوذ باللہ خدا انسانوں کے مقام پر اتر آتا ہے۔ اس عقیدہ کا بھونڈا پن اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ ملائکہ کو شافع ماننے والے ان کو خدا کی بیٹیاں مانتے ہیں۔ حالانکہ انسان اپنے لیے تو بیٹوں کو پسند کرتا ہے لیکن جس کو وہ خالق کل سمجھتا ہے اس کے لیے بیٹیاں گھڑ لی گئی ہیں۔ اس کی کوئی عقلی، فطری اور نقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہ تو انہوں نے قیامت کی جواب دہی سے بچنے کے لیے چور راستہ تلاش کر رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"تو ان سے پوچھو، کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے! کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ دیکھ رہے تھے! آگاہ، یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہے، اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے! کیا تمہارے پاس کوئی واضح حجت ہے! پس پیش کرو تم اپنی کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو"۔ (الصافات: ۱۴۹۔۱۵۷)

مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت میں ایک شدید قسم کی جہالت ہے لیکن جہالت پر جہالت یہ ہے کہ خدا کے لیے انہوں نے وہ چیز پسند کی ہے جو اپنے لیے ناپسند کرتے

ہیں۔ حالانکہ عقل وفطرت کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کی طرف اس کی شایان شان صفات منسوب کی جائیں۔ انہوں نے صرف یہی ظلم نہیں کیا ہے کہ اس کی طرف اس کی شان کے منافی صفت منسوب کی ہے بلکہ ایک ایسی صفت منسوب کی ہے جس کو خود اپنے لیے بھی باعث ننگ خیال کرتے ہیں۔ پھر یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ ان کے پاس اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے؟ جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تو کیا یہ لوگ اس وقت موجود تھے۔

خدا کو اگر اولاد ہی کا شوق تھا تو سوچنے کی بات ہے کہ اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو کیوں ترجیح دی۔ وہ جب بیٹے پیدا کر سکتا تھا تو آخر اس نے اپنے لیے وہ چیز کیوں پسند کی جس کو تم اپنے لیے بادل ناخواستہ میں گوارا کرتے ہو۔ یہ تو بڑی کم عقلی کی بات ہوئی۔ مزید فرمایا کہ اگر کوئی آسمانی کتاب کی شہادت تمہارے پاس موجود ہے تو اس کو پیش کرو۔ خدا کے باب میں کسی کو کوئی بات من گھڑت کہنے کا حق نہیں ہے۔ البتہ دلیل و برہان کی بنیاد پر کہنے کا حق ہے اور سب سے زیادہ واضح برہان اس کی کتاب ہو سکتی ہے جو اس نے لوگوں کی تعلیم وہدایت کے لیے اتاری۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرشتوں کی حیثیت واضح کی گئی ہے کہ ان کی حیثیت خدا کے محکوم اور فرمانبردار اہل کاروں کی ہے۔ وہ نہ اپنے حدود سے باہر پر مار سکتے ہیں، نہ کسی امر میں خدا کے اذن کے بغیر دخل دے سکتے ہیں، نہ کوئی کام بطور خود کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ فرشتوں کی اس حیثیت کی وضاحت فرشتوں کے گل سرسبد حضرت جبریلؑ کی زبان سے کرائی گئی ہے:

"اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک متعین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور بس صرف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں"۔

(الصافات:۱۶۴۔۱۶۶)

فرشتوں کے خدا کی اولاد ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا رہنے والوں کے وہم پر ضرب لگانے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر چیز یہی ہو سکتی تھی کہ فرشتوں کے سردار حضرت جبریل امین اپنی اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح کریں۔

جنوں کی حیثیت کا غلط تصور:

آخرت کی جوابدہی سے بچنے کے لیے مشرکین نے جس طرح فرشتوں کو خدا کی ذات میں شریک ٹھہرا لیا تھا اسی طرح جنات کو بھی خدا کے حقوق اور صفات میں شریک کر لیا تھا۔ ان لوگوں نے جنات کو نافع وضار سمجھ کر ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ وہ ان کو راضی رکھنے کے لیے قربانیاں دیتے۔ جنات کو

علم غیب کے حصول کا ذریعہ بھی سمجھ لیا گیا۔ وہ ان کی عبادت کرتے اور ان کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کی طرح جنات بھی خدا کی مخلوق ہیں انہیں بھی اختیار وارادہ کی آزادی حاصل ہے اس لیے انہیں بھی خدا کے سامنے مسئول ہونا چاہیے۔ ان کا بھی روز قیامت حساب کتاب ہونا چاہیے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی چاہیے۔ ایک ایسی مخلوق جو خود اپنے جرم کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوگی اس کے متعلق یہ تصور کر لینا کہ جزا اور سزا کے دن وہ اپنے پوجنے والوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکے گی نہایت ہی کم عقلی کی بات ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"اور انہوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب پتا ہے کہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں۔ پس تم اور جن کو پوجتے ہو خدا سے برگشتہ نہیں کر سکتے مگر انہی کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں"۔ (صافات:۱۵۸۔۱۶۳)

جہاں تک دیوی دیوتاؤں کا تعلق ہے تو وہ کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت محض فرضی اور تصوراتی ہے۔ عربوں کے تصور کے مطابق وہ فرشتوں اور جنوں کی مورتیاں تھیں جو پتھر، مٹی، لکڑی یا دوسری دھاتوں سے تراشی گئی تھیں۔ ان کے متعلق قرآن مجید میں صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اپنے پوجنے والوں کے ساتھ یہ پتھر کے اصنام بھی دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ لہٰذا وہ اپنے پجاریوں کے لیے خدا کی گرفت سے بچنے کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

شفاعت کا صحیح تصور:

کفار ومشرکین کے لیے شفاعت کی فی الجملہ نفی کے باوجود قرآن نے شفاعت کا اثبات بھی کیا ہے لیکن یہ کوئی مطلق شفاعت نہیں ہوگی کہ کوئی فرشتہ یا انسان اپنے طور پر خدا کے سامنے کھڑا ہو جائے اور جن لوگوں کے بارے میں چاہے سفارش کرنا شروع کر دے۔ یہ شفاعت محدود ہوگی اور اس پر کئی پابندیاں ہوں گی۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر شفاعت کے جو اصول اور قیود وشرائط بیان کیے ہیں اگر ان کو مختصر طور پر یکجا کیا جائے تو وہ اس طرح ہیں:

۱۔ اللہ کے سوا جن پر شفاعت کے لیے مشرکین نے از خود تکیہ کر لیا ہوگا ان کو شفاعت کا اختیار نہیں ہوگا۔ فرمایا:

"اور جن کو یہ اس کے علاوہ پکارتے ہیں وہ سفارش پر اختیار نہیں رکھیں گے مگر وہ جو

حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے بھی ہوں گے''۔(الزخرف:۸۶)

یعنی اس دن سفارش کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہو گا البتہ اللہ تعالیٰ جن کو اجازت مرحمت فرمائے گا وہ حق بات کی ہی گواہی دیں گے اور وہ گواہی اس بات کی ہو گی جس کو وہ جانتے ہوں گے۔

۲۔ قیامت کے دن خدا کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں ہو گی کیونکہ جب سب خدا ہی کے محکوم ہیں تو کس کی مجال ہے کہ وہ خدا کے اذن کے بغیر زبان کھولے۔ سورہ نباء میں فرمایا:

''اور جس دن جبریل اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے وہ نہیں بات کریں گے مگر جس کو خدائے رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا''۔ نباء:۳۸)

فرمایا:

''اور اس کے ہاں کوئی شفاعت کارگر نہیں ہو گی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اجازت دے''۔(سبا:۲۳)

یعنی جو لوگ اپنے مزعومہ شفعاء پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں انہیں انتباہ کیا ہے کہ یاد رکھو خدا کے حضور میں کسی کی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہو گی یعنی اول تو خدا کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت کی جرأت نہیں کرے گا پھر اگر اجازت ہوئی بھی تو وہ شفاعت صرف اسی کے لیے کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت مرحمت ہو گی۔ کسی ایسے شخص کے بارے میں وہ زبان نہیں کھول سکے گا جس کے لیے اس کو اجازت نہ ملی ہو۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا:

''کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے''(بقرہ:۲۵۵)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے سامنے کسی کے بارے میں زبان کھولنے کی جسارت تو وہ کرے جو خدا کی معلومات میں کچھ اضافہ کر سکتا ہو اور یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو پوری آگاہی نہیں ہے (نعوذ باللہ) اور اسے ہے۔ لیکن یہ حیثیت کس کی ہے؟ اللہ تعالیٰ سب کے آگے اور پیچھے اور اس کے ماضی و مستقبل ہر چیز سے باخبر ہے۔ برعکس اس کے دوسرے کسی کا بھی درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے کسی حصے کا بھی احاطہ کر سکے۔ دوسروں کے لیے اس کے علم میں سے بس اتنا ہی

علم ہے جتنا وہ از خود اپنے بندوں میں سے کسی پر کھول دے۔

۳۔ شفاعت عام نہیں ہو گی بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے کی جا سکے گی جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے گا۔

''اس دن شفاعت کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے''۔(طٰہٰ:۱۰۹)

''اللہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر ان کے لیے جن کے لیے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے ڈرتے ہوں''۔(انبیاء:۲۸)

۴۔ شفاعت کرنے والے صرف حق بات کہیں گے کیونکہ علام الغیوب کے علم میں کوئی شخص بھی اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات اوپر سورہ زخرف ۸۶ اور سورہ نبا ۳۸ کے حوالہ سے بیان ہوئی ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی قسم کی شفاعت باطل کو حق اور حق کو باطل نہیں کر سکے گی۔ ان تمام قیود کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے اسی لیے شفاعت بھی تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس کے حضور میں کوئی اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کی جسارت نہیں کر سکے گا۔ اذن کے بعد جو زبان کھولے گا وہ صرف اسی کے لیے زبان کھولے گا جس کے لیے اس کو اجازت دی گئی ہو گی۔ پھر وہ وہی بات کہے گا جو بالکل حق ہو گی۔ خدا کے آگے کوئی غلط بات کہنے کی کسی کے لیے گنجائش نہیں ہو گی۔

شفاعت کن کے لیے:

میزان قیامت میں وزن صرف حق کا ہو گا۔ میزان میں جن کی نیکیوں کا وزن زیادہ ہو گا وہ جنت میں جائیں گے اور جن کی بدیوں کا پلڑا بھاری ہو گا وہ جہنم رسید ہوں گے لیکن ایسی صورت میں بھی ممکن ہے کہ کسی کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں۔ عقل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے لوگوں کو دوزخ میں نہ ڈالا جائے۔ اس لیے یہ لوگ خدا کی رحمت اور اس کے نیک بندوں کی شفاعت سے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ اسی طرح ایمان و عمل صالح اور توبہ و اصلاح کی زندگی گزارنے والے بھی، جن سے کوتاہی یا غفلت ہوئی ہو، وہ شفاعت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور خدا کی رحمت سے بعید نہیں کہ یہ لوگ بخشے جائیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں صراحت ہے کہ ایمان رکھنے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو

جاتا ہے اور وہ اس کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنا لیتے بلکہ گناہ کے فوراً بعد توبہ کر لیتے ہیں تو ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور ان کا گناہ معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن جو لوگ گناہ کرتے رہیں اور متواتر گناہ کرنے کے کافی عرصہ بعد توبہ کریں ان کی توبہ کی قبولیت کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ ایسے لوگ بھی شفاعت کی توقع کر سکتے ہیں۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شرک و الحاد کی زندگی گزارنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہیں ہو سکتی۔ جنھوں نے ساری زندگی خدا کے باغی کی حیثیت سے گزاری یا ایمان کے مدعی تو رہے مگر ساری زندگی باطل کی پیروی اور خدا اور رسول کی نافرمانی میں گزاری، پھر انھیں توبہ کی توفیق بھی نہ ہوئی تو یہ لوگ کس بنیاد پر شفاعت کی توقع کر سکتے ہیں۔

شفاعت کا مقام کن کو حاصل ہوگا:

قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کا مقام ایک منصب تکریم و تشریف ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرمائے گا جو اس اکرام و اعزاز کے سزاوار ہوں گے۔ ان میں سر فہرست انبیاء و رسل ہوں گے۔ ان کے بعد شہدائے امت، صدیقین و صالحین کو یہ عزت حاصل ہوگی۔ یہ لوگ بھی خدا کی اجازت سے شفاعت کریں گے اور صرف ان لوگوں کے لیے کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے گا اور یہ اپنی شفاعت میں وہی بات کہیں گے جو بالکل حق ہوگی۔

(جاری)

اہل ''محدث'' کے نام

ماہنامہ ''محدث'' مکتب اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ یہ ان جرائد میں شمار کیا جاتا ہے جن کا مزاج سنجیدہ اور اسلوب بیان علمی ہے۔ سنجیدہ اور علمی جریدوں کے مصنفین اپنی بات کو دلیل و برہان کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں۔ اگر کبھی نقد و جرح کی ضرورت پیش آئے تو طنز و تعریض، طعن و تشنیع اور دشنام طرازی کے بجائے مکالمے اور تبادلۂ خیالات کا انداز اختیار کرتے اور زبان و بیان کے ان مسلمات کو پیش نظر رکھتے ہیں جو تہذیب، شائستگی اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کو مستلزم ہیں۔

ہمارے لیے باعث تعجب ہے کہ اگست ۲۰۰۱ء کا ''محدث'' اس تاثر سے بہت مختلف ہے۔ یہ شمارہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے بارے میں نقد و تبصرے پر مبنی ہے۔ اس کے تقریباً سبھی مضامین میں ان کے طرز فکر، بالخصوص حدیث کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر زیر تنقید موضوعات کے حوالے سے کوئی علمی مکالمہ نہیں ہے، ہمارا منشا محض اہل محدث کو ان مسلمات کی طرف متوجہ کرنا ہے جو تنقید و اختلاف کے حوالے سے دین و اخلاق کا تقاضا ہیں۔ ہم اسے اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ پورے اخلاص کے ساتھ اپنے بھائیوں کو ان تجاوزات سے آگاہ کریں جو دانستہ یا نادانستہ طور پر ان سے صادر ہو گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہل محدث ہماری معروضات پر غور فرمائیں گے۔

تنقید اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مستحسن عمل ہے۔ اس کے نتیجے میں حق کے وضوح کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اہل علم و دانش جانتے ہیں کہ وہی تنقید موثر اور باعث خیر ہوتی ہے جس میں حسب ذیل مسلمات کو سامنے رکھا گیا ہو:

۱۔ جس شخص پر تنقید پیش نظر ہے، اس کا نقطۂ نظر پوری دیانت داری سے سمجھا جائے۔
۲۔ اگر اسے کہیں بیان کرنا مقصود ہو تو بے کم و کاست بیان کیا جائے۔
۳۔ جس دائرے میں تنقید کی جا رہی ہے، اپنی بات اسی دائرے تک محدود رکھی جائے۔
۴۔ اگر کوئی الزام یا مقدمہ قائم کیا جائے تو وہ ہر لحاظ سے ثابت اور موکد ہو۔
۵۔ مخاطب کی نیت پر حملہ نہ کیا جائے، بلکہ استدلال تک محدود رہا جائے۔

۶۔ بات کو اتفاق سے اختلاف کی طرف لے جایا جائے نہ کہ اختلاف سے اتفاق کی طرف۔

۷۔ پیش نظر ابطال نہیں، بلکہ اصلاح ہو۔

۸۔ اسلوب بیان شایستہ ہو۔

یہ اور اس نوعیت کے بعض دوسرے امور تنقید کے مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اہل محدث کا کوئی خیر خواہ درج بالا نکات میں سے ایک ایک نکتے کو سامنے رکھ کر ان کے لیے تذکیر و نصیحت کا فریضہ انجام دے، مگر ہم یہاں صرف ان مقامات کے بارے میں متوجہ کریں گے جن میں علمی دیانت کا لحاظ نہیں رکھا جا سکا اور بات کی پوری تحقیق کیے بغیر محض الزام عائد کرنے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

مولانا اصلاحی کے حدیث کے بارے میں طرز عمل کو بیان کرتے ہوئے اہل محدث نے لکھا ہے:

> ''(مولانا اصلاحی) نے قرآن پر تدبر کرنے، یعنی اپنی عقل و قیاس سے قرآنی حقائق کا حلیہ بگاڑنے کے بعد، اب حدیث کا روئے آبدار مسخ کرنے کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے چند محاضرات (لیکچروں) کا اہتمام فرمایا۔ انہی محاضرات کے مجموعے کا نام 'مبادی تدبر حدیث' نامی کتاب ہے، جس میں حدیث کے پرکھنے کے تمام اصولوں کو ناکافی اور بے وقعت قرار دیتے ہوئے نئے اصول وضع کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے تاکہ محدثین کی بے مثال کاوشوں پر پانی پھیر دیا جائے اور لوگوں کو ایسے ہتھیار فراہم کر دیے جائیں جنہیں استعمال کر کے وہ جس حدیث صحیح کو چاہیں رد کر دیں اور جس ضعیف اور باطل حدیث کو چاہیں صحیح قرار دے لیں۔ دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ حدیث کے پرکھنے کے لیے محدثانہ اصول و قواعد میں جو خامیاں رہ گئی تھیں، اس کتاب میں ان کا ازالہ کیا گیا ہے اور ایسے نئے قواعد اصول وضع کیے گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں تمام احادیث کو نئے سرے سے پرکھا جا سکے۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے؟ لیکن اسی بلند و بانگ دعوے میں حدیث کا انکار مضمر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام بخاری جیسے امام فن نے بھی اگر کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دیا ہے تو محدثین کے اصول و قواعد میں ایسی خامیاں ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے امام بخاری کے فیصلے کے برعکس صحیح حدیث، ضعیف اور ضعیف حدیث صحیح ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اصلاحی صاحب کے گھڑے ہوئے اصولوں کی روشنی میں تمام ذخیرۂ حدیث کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ یہ انکار حدیث کا راستہ چوپٹ کھولنے کے مترادف نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور کیا یہ محدثین کی تمام کاوشوں پر خط تنسیخ پھیرنا نہیں ہے؟
>
> برعکس نہند نام زنگی کافور، دنیا کی عام روش ہے۔ لیکن فساد کا نام اصلاح یا شراب کا نام روح افزا رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی ہے۔ یہ غرور نفس، دل کا بہلاوا اور تسویل

شیطان ہے''۔ (محدث ۴۴)

آیئے اس پیراگراف میں عائد کیے گئے الزامات کا ایک نظر میں جائزہ لیتے ہیں:

ایک الزام یہ عائد کیا گیا ہے کہ مولانا اصلاحی نے محدثانہ اصولوں کو ناکافی اور بے وقعت قرار دیا ہے۔

یہ الزام جیسا کہ اقتباس سے ظاہر ہے، مولانا اصلاحی کی کتاب ''مبادی تدبر حدیث'' کو بنیاد بنا کر عائد کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس موقع پر اسی کتاب کے یہ جملے ان کی نظر سے کیسے مخفی رہ گئے:

> ''اس مضمون میں وہ اصول و مبادی میں نے بیان کر دیے ہیں جو احادیث کو سمجھنے اور ان کی صحت و سقم کا فیصلہ کرنے کے لیے میں ضروری سمجھتا ہوں اور جن کو میں نے ملحوظ رکھا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے، جس میں کوئی مجھے منفرد قرار دے سکے۔ یہ ساری باتیں ہمارے ائمہ حدیث کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں اور یہ ایسی معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جو لوگ صرف اپنے فقہی مسلک ہی کی حدیثیں پڑھنے پڑھانے پر قانع ہیں ان کا کام بہت سہل ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ ان اصولوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ ان سے متوحش ہوں۔ لیکن جن کو پورے ذخیرۂ حدیث کی چھان بین کرنی اور اس کو دین کے ماخذ کی حیثیت سے تمام خلق کے سامنے پیش بھی کرنا ہو، ان کے ہاتھوں میں ایک ایسی کسوٹی کا ہونا ضروری ہے جس کو ایک کسوٹی تسلیم کرنے سے کوئی صاحب انصاف انکار نہ کر سکے''۔
>
> (مبادی تدبر حدیث ص ۱۶)

دوسرا الزام یہ عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے فہم حدیث کے نئے اصول وضع کیے ہیں۔

فہم حدیث کے لیے عقل و استدلال کی بنیاد پر کوئی ایسا اصول وضع کرنا جو متقدمین نے وضع نہ کیا ہو، کسی لحاظ سے بھی لائق تہمت نہیں ہے۔ اس ضمن میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، مگر اس کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ اصلاحی صاحب قدما سے کسی مختلف جگہ پر کھڑے ہی نہیں ہیں۔ ''مبادی تدبر حدیث'' کو اگر فی الواقع پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مولانا اصلاحی نے تدبر حدیث اور روایت کے رد و قبول کے جو اصول بیان کیے ہیں، وہ قدما کے کام سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔

انہوں نے تدبر حدیث کے یہ پانچ بنیادی اصول بیان کیے ہیں:

۱۔ قرآن مجید ہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔

۲۔ ہر حدیث، احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جز ہے۔

۳۔ حدیث کی اصل زبان عربی ہے۔

۴۔ کلام کے عموم و خصوص، موقع و محل اور خطاب کا فہم ضروری ہے۔

۵۔ دین اور عقل و فطرت میں منافات نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ سلف صالحین نے ان باتوں کو اس طرح متعین طریقے سے بیان نہ کیا ہو، لیکن کیا ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جسے ہمارے جلیل القدر ائمہ نے اختیار نہ کیا ہو یا جس سے صرف نظر کیا ہو؟ کوئی ایسی بات ہے تو اہل محدث کو اسے ضرور بیان کرنا چاہیے۔

اسی طرح حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے اصولوں کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مولانا اصلاحی پورے اصرار کے ساتھ ائمہ سلف کے اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے ہمارے نزدیک چھ بنیادی اصول ہیں جن کی حیثیت فن حدیث میں اساسی کلیات کی ہے۔ ان اصولوں کی رہنمائی میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب روایات کے صحیح اور سقیم میں نہ صرف یہ کہ امتیاز آسان ہو جاتا ہے، بلکہ علم حدیث سے کما حقہ فیض یاب ہونے کے لیے حدیث کے طالب علم کو ان کا ہمیشہ پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔

یہ ایک نہایت حساس موضوع ہے اس لیے ہم اس امر کا اہتمام ضروری خیال کرتے ہیں کہ اپنے مباحث کی بنیاد احادیث رسول اور سلف صالحین کے ارشادات ہی پر رکھیں، اپنی جانب سے کوئی بات نہ کہیں۔ اس موضوع پر پیچھے بھی بعض ضروری باتیں عرض کی جا چکی ہیں، یہاں مقصود ان کو ایک ضابطے کے تحت لانا ہے تاکہ پوری بحث سمٹ کر سامنے آ جائے۔

ہمارے سلف میں اصول حدیث پر خطیب بغدادی علیہ الرحمۃ کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ تمام ضروری مباحث اپنی شان دار کتاب ''الکفایہ فی علم الروایۃ'' میں پیش کیے ہیں۔ ہماری یہ بحث بیشتر اس کے مندرجہ ذیل ابواب سے مستنبط ہے''۔

(مبادی تدبر حدیث ۵۷)

اس پیراگراف میں تیسرا الزام یہ عائد کیا گیا ہے کہ ''مبادی تدبر حدیث'' میں محدثین کی کاوشوں کی نفی کی گئی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بات قارئین کے لیے باعث حیرت ہو کہ اس ضمن میں مولانا کا نقطۂ نظر اس کے بالکل برعکس ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور علمی دیانت کی داد دیجیے:

''حدیث کے طالب علموں کو جملہ رواۃ حدیث کے بارے میں جرح و تعدیل کے لیے بہر حال سلف کی تحقیقات پر ہی قناعت کرنی پڑے گی اور بجز انہی کی تحقیقات کی کسوٹی پر کسی سند کے راویوں کا درجہ متعین کیا جائے گا۔ چنانچہ اب کسی حدیث کی سند کو متقدمین کی فراہم کردہ انہی معلومات کی روشنی میں جانچا پرکھا جائے گا۔ اس لیے کہ ذرائع تحقیق مرور زمانہ سے اب معدوم

ہو چکے ہیں۔ اس میں ہمارے ان اکابرین فن نے تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھوا ہے اور انسانی امکان کی حد تک اس فن کی خدمت کی ہے''۔ (مبادی تدبر حدیث ۹۱)

ایک اور مقام پر دیکھیے:

''ملت اسلامیہ کا یہ بے مثل کارنامہ ہے کہ اس کے عظیم محدثین نے صدر اول میں رسول اللہ ﷺ کے حقیقی اور صحیح علم کو ممکنہ حد تک خلط و غش سے پاک کر کے قابل اعتماد ذخیرۂ احادیث کی شکل میں مامون و محفوظ کیا۔ احادیث کی جمع و تدوین کا یہ عظیم کام، ائمۂ فن حدیث کے مقرر کردہ بے لاگ اصولوں کی روشنی میں دوسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر تیسری صدی ہجری کے وسط کے درمیانی عرصہ میں انجام پایا۔ اس زمانے کو عصر روایت کے شباب کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں حدیث کا قابل قدر سرمایہ تحریری شکل میں مختلف مجموعوں کی صورت میں محفوظ ہو گیا اور یوں عصر روایت کا اختتام ہو گیا۔ اپنی صفات و خصوصیات کی بنا پر ان مجموعوں کو قبولیت خواص و عوام اور شہرت دوام حاصل ہوئی''۔ (مبادی تدبر حدیث ۱۴۳)

بخاری و مسلم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعلق یہ بات مشہور عوام و خواص ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جو چند ہزار حدیثیں لی گئی ہیں، وہ لاکھوں حدیثوں کے انبار میں سے چھانٹ کر لی گئی ہیں۔ ذرا اندازہ کیجیے ان عظیم خادمان حدیث کی اس محنت شاقہ کا جو رطب و یابس روایات کے انبار میں سے چند ہزار جواہر ریزوں کو چھانٹنے میں ان کو برداشت کرنی پڑی ہو گی۔ ان کی اس جاں گداز محنت ہی کی بدولت آپ کو یہ روایات ان کتابوں میں اس شکل میں ملتی ہیں کہ ثقہ کی ثقہ سے روایت کے زینہ سے چڑھتے ہوئے آپ بغیر کسی شائبہ ارسال و انقطاع اور بدون کسی اندیشۂ تدلیس کے جناب رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ اقدس تک پہنچ جاتے ہیں۔

بہر حال ان اماموں کی خدمت کی داد دیجیے۔ ان کی یہی خدمت اتنی بڑی ہے کہ ہم ان کے سامنے گردن نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے معیار حدیث کی بنیاد پر امت نے صحیحین کو یہ درجہ دیا ہے کہ ان کا مقام صدر اول سے فن حدیث کی امہات کے طور پر رہا ہے اور یہ مقام موطا امام مالک کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ ان کے بعد اگر کچھ اور لوگوں نے بھی کام کیا ہے تو انہی کی اتباع میں کیا ہے''۔ (۱۵۲)

صحیح بخاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحیح بخاری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا معیار سند موطا کے سوا سارے ذخیرۂ احادیث میں سب سے عالی ہے۔ سند کے معاملے میں امام بخاری کی احتیاط اپنے نقطۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے باوجود ایک ہزار سے زیادہ شیوخ حدیث

سے اخذ و استفادہ کے صرف انہی محدثین کی روایتیں منتخب کیں جو ایمان کو قول و عمل کا مجموعہ قرار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے کلامی اعتبار سے کتاب کی شان نہایت نمایاں ہے اور اس کے بغور مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت یہ پہلو بھی پوری طرح سے ان کے پیش نظر رہا ہے کہ مرجئہ اور ان کے جتنے ہم مشرب گروہ ان کے زمانے میں تھے اور انہوں نے جو فتنے ان دنوں اٹھائے تھے ان کا قلع قمع کیا جائے .... اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح کے عنوانات ایک خاص طریقہ سے مرتب کیے ہیں جس سے ان کی وسعت علم اور تفقہ فی الدین کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی وجہ سے تربیت فکر کے پہلو سے اس کا درجہ بڑا اونچا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ یہ دماغ کو جھنجھوڑتی اور غور کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لیے تفہیم دین کے لیے یہ نہایت اہم ہے"۔ (۱۵۳)

"محدث" کے خیال میں:

"مولانا اصلاحی کا موقف یہ ہے کہ حدیثیں ظنی الثبوت اور مجموعۂ رطب و یابس ہیں۔ اگر کوئی حدیث سنت متواترہ کے مطابق ہے تو یہ اس سنت متواترہ کی تائید مزید ہے اور اگر اس کے خلاف ہے تو قابل رد ہے"۔ (۴۷)

اس بیان کے لیے "مبادی تدبر حدیث" کے صفحہ ۲۸ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس صفحے پر "مجموعہ رطب و یابس" کے الفاظ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ بلاشبہ مولانا نے سنت متواترہ کو اخبار آحاد پر ترجیح دی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے پورے استدلال سے بات کی ہے اور احتیاط کے تقاضوں کو ہر طرح سے ملحوظ رکھا ہے۔ صفحہ ۲۸ پر ان کے اصل الفاظ دیکھیے اور پھر ان کا اہل محدث کی روایت بالمعنی سے تقابل کیجیے:

"جس طرح قرآن قولی تواتر سے ثابت ہے اسی طرح سنت امت کے عملی تواتر سے ثابت ہے۔ مثلاً ہم نے نماز اور حج وغیرہ کی تمام تفصیلات اس وجہ سے اختیار نہیں کیں کہ ان کو چند راویوں نے بیان کیا، بلکہ یہ چیزیں نبی ﷺ نے اختیار فرمائیں۔ آپ سے صحابہ کرام نے، ان سے تابعین، پھر تبع تابعین نے سیکھا۔ اسی طرح بعد والے اپنے اگلوں سے سیکھتے چلے آئے۔ اگر روایات کے ریکارڈ میں ان کی تائید موجود ہے تو یہ اس کی مزید شہادت ہے۔ اگر وہ عملی تواتر کے مطابق ہے تو فبہا اور اگر دونوں میں فرق ہے تو ترجیح بہر حال امت کے عملی تواتر کو حاصل ہوگی۔ اگر کسی معاملے میں اخبار آحاد ایسی ہیں کہ عملی تواتر کے ساتھ ان کی مطابقت نہیں ہو رہی تو ان کی توجیہ تلاش کی جائے گی۔ اگر توجیہ نہیں ہو سکے گی تو بہر حال انہیں مجبوراً چھوڑا جائے گا، اس لیے کہ وہ ظنی ہیں اور سنت ان کے بالمقابل قطعی ہے"۔ (مبادی تدبر حدیث ۲۸)

اس اقتباس سے یہ چند باتیں بالکل واضح ہیں:

ایک یہ کہ وہ یہاں سنت اور حدیث میں باعتبار تواتر فرق واضح کر رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ جس طرح قولی تواتر سے ملنے والے قرآن مجید اور کسی روایت میں عدم مطابقت ہو تو قرآن مجید کی بات فائق سمجھی جائے گی، اسی طرح عملی تواتر سے ملنے والی سنت اور روایت میں کوئی فرق ہو تو ترجیح سنت کو حاصل ہوگی۔

تیسرے یہ کہ اگر کسی موقعے پر سنت اور اخبار آحاد باہم غیر مطابق ہوں تو یک قلم اخبار آحاد کو رد نہیں کر دیا جائے گا، بلکہ ان کی کوئی توجیہ تلاش کی جائے گی۔

چوتھے یہ کہ اگر توجیہ ممکن نہ ہو تو پھر مجبوراً سنت کو اخبار آحاد پر ترجیح دینا پڑے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مضمون کو جن الفاظ کا جامہ اہل محدث نے پہنایا ہے، وہ کس زمرہ علم و تحقیق میں آتا ہے؟

اسی دیانت کی ایک اور مثال وہ مقام ہے جہاں مولانا اصلاحی پر انکار حدیث کا الزام عائد کر کے یہ کہا گیا ہے کہ مولانا اس جرم کا خود اعتراف کرتے ہیں۔ اس بیان اعتراف جرم کے لیے جو دلائل فراہم کیے گئے ہیں، ان میں اور وضع کردہ مقدمے میں اتنا ہی تعلق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے یا جو سیاہ اور سفید میں ہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

"ان سب کے افکار کا ایک ہی نتیجہ نکلا ہے اور نکل رہا ہے کہ جو بھی حدیث ان کے ذہنی اختراع، خانہ ساز نظریے اور اپنی عقل نارسا کے خلاف محسوس ہوئی، چاہے وہ روایت و درایت کے لحاظ سے کتنی ہی قوی ہو، اس کا انکار کرنے، بلکہ اس کا مذاق اڑانے میں انہیں کوئی تامل اور حجاب نہیں۔ ہماری اس بات کا یقین نہ ہو تو خود ان حضرات کا اعتراف ملاحظہ ہو:

سرسید کی 'تفسیر القرآن' کا بھی فوٹو ایڈیشن شائع ہوا ہے، اس کے شروع میں مشہور منکر حدیث پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا تعارف ہے۔ اس میں یہ صاحب لکھتے ہیں:

۱۹۰۵ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب میانوالی تشریف لائے، ان دنوں ان کی کتاب 'تفسیر القرآن' (غالباً یہ مبادی تدبر قرآن ہوگی، ناقل) شائع ہوئی تھی، جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے حلقوں کی جانب سے اس کتاب کی بڑی تعریف کی جا رہی تھی۔ اس قسم کی ایک تعریفی مجلس میں جس میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب بھی موجود تھے، راقم نے عرض کیا کہ سرسید احمد خان نے یہی اصول اپنے رسالے اصول تفسیر میں بیان کیے ہیں، اس پر مولانا کا رنگ فق ہو گیا اور فرمایا کہ کیا کسی کے پاس یہ رسالہ موجود ہے۔ راقم نے اثبات میں جواب دیا تو مزید کچھ کہنے کی بجائے خاموش ہو گئے"۔ (مطبوعہ دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور) (محدث ۸)

اس اقتباس میں پروفیسر رفیع اللہ صاحب شہاب کا ایک اقتباس بطور دلیل نقل کیا گیا ہے۔
اس میں دیکھیے مولانا اصلاحی کے الفاظ نہیں، بلکہ ایک واقعہ نقل ہوا ہے۔
یہ واقعہ مولانا سے فکری اختلاف رکھنے والے شخص نے بیان کیا ہے۔
واقعے میں مولانا اصلاحی کا کوئی ایک جملہ بھی نقل نہیں ہوا۔
واقعہ نگار کو مذکورہ کتاب کا نام تک یاد نہیں ہے۔
واقعہ مولانا کے اصول تدبر حدیث سے متعلق نہیں، بلکہ اصول تدبر قرآن سے متعلق ہے۔
یہ اس بیان اعتراف جرم کی حقیقت ہے۔

اہل محدث نے مولانا اصلاحی پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا ہے کہ وہ جاہلی ادب کے مقابلے میں حدیث کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا اصلاحی کی ایک عظیم گمراہی یا فکری تضاد یہ ہے کہ ان کے ہاں حدیث رسول کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ قرآن فہمی کے لیے جاہلی ادب کو سب سے زیادہ ضروری قرار دیتے ہیں، جس کی سرے سے کوئی سند ہی نہیں ہے، اس کے مقابلے میں وہ حدیث کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں......... آخری دور میں جب انہوں نے اپنی توجہ تفسیر پر مبذول کر دی تو حدیث کو نظر انداز کر دیا، اور حدیث رسول کے مقابلے میں لغت کو، جاہلی ادب کو اور اپنی عقل وفہم کو زیادہ اہمیت دی۔'' (محدث ۲۵)

تعجب ہے کہ یہ بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں جن کے اپنے قلم سے قرآن وحدیث کے تراجم، تفاسیر اور تشریحات صادر ہو چکی ہیں۔ یہ خدمات انجام دیتے ہوئے کیا انہوں نے ہزاروں مرتبہ لغت کی مراجعت نہیں کی ہے؟ کیا وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ یہ لغات آسمان سے نازل نہیں ہوئیں، بلکہ محققین لسانیات نے کلام عرب کا تتبع کر کے تصنیف کی ہیں؟ کیا وہ ترجمہ وتشریح کرتے وقت اور قرآن و حدیث کے الفاظ کا مدعا ومفہوم متعین کرتے وقت اپنی عقل وفہم کے دروازوں کو بند کر لیتے ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو ہمیں ان سے کچھ نہیں کہنا، لیکن اگر وہ ان کا جواب نفی میں دیتے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ ان کے اور مولانا اصلاحی اور قدیم وجدید محققین قرآن وحدیث کے مابین کم سے کم طریقہ کار کے لحاظ سے وہ کیا فرق ہے جو باقی رہ جاتا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ مولانا اصلاحی جاہلی ادب کو قرآن مجید اور حدیث کی زبان سمجھنے کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ اپنی تحریروں میں بیان کی ہے۔ چنانچہ دیکھیے:

> ''قرآن کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ عربی جو فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جن وبشر میں سے کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے مثل کلام پیش کر سکے۔ اس درجے ومرتبے کے کلام کے زور واثر اور اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام، ظاہر ہے کہ وہ اس کے ترجموں، اس کی تفسیر اور اس کے لغتوں کے ذریعے سے نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لیے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا، جس میں وہ کلام ہے .... عربی زبان بالخصوص قرآن کی زبان کے معاملے میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس وقت وہ زبان کہیں بھی رائج نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ عرب وعجم دونوں ہی میں اس وقت جو عربی پڑھائی جاتی ہے اور لکھی بولی جاتی ہے وہ اپنے اسلوب وانداز، اپنے لب ولہجہ اور اپنے الفاظ ومحاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن ہے۔ قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے، وہ نہ تو حریری وتنبی کی زبان ہے، نہ مصر وشام کے اخبارات ورسائل کی، بلکہ وہ اس ٹکسالی زبان میں ہے جو امراء القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعرا اور قیس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دور جاہلیت کے شعرا وادبا کے کلام کے محاسن ومعایب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔'' (تدبر قرآن ۱/۱۴)

''مبادی تدبر حدیث'' میں لکھتے ہیں:

> ''حدیث کی اصل زبان ٹکسالی عربی ہے۔ اگرچہ حدیث کی روایت، قرآن کے برعکس بیشتر بالمعنی ہوئی ہے، تاہم صحیح احادیث کی زبان کا ایک خاص معیار ہے جو بہت اعلیٰ ہے۔ احادیث کی زبان دوسری چیزوں کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ احادیث کے مجموعے مدون و مرتب ہو گئے اور عہد روایت کے ایک خاص دور تک کی زبان ان میں محفوظ ہو گئی۔ حدیث کی لغوی ونحوی مشکلات کے حل میں ان فنون کے ماہرین ہی کی آرا معتبر سمجھی جائیں گی۔ زبان کی باریکیوں کے معاملے میں مسلم لغویوں اور نحویوں کا مقام بہر حال ارفع واعلیٰ تسلیم کرنا ہوگا اور تحقیق کے دوران میں ان کی تعبیر اور رائے اوثق سمجھی جائے گی۔'' (۵۱)

ایک مقدمہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ مولانا کے حدیث پر کام کے نتیجے میں ان کا قرآن کو ماننے کا دعویٰ بھی بے حیثیت قرار پاتا ہے اور اس بات کو مولانا اصلاحی نے خود تسلیم کیا ہے۔ ''تسلیم'' کے لیے جو استدلال کیا گیا ہے، وہ اس قدر معرکہ آرا ہے کہ علم وتحقیق کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ ''محدث'' کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''مولانا اصلاحی صاحب کی کتاب 'مبادی تدبر حدیث' ایک نہایت خطرناک کتاب ہے جس میں محدثین کی کاوشوں کی نفی یا ان کا استخفاف کر کے انکار حدیث کا راستہ چوپٹ کھول دیا گیا ہے جس

کے بعد قرآن کو ماننے کا دعویٰ بھی بے حیثیت قرار پاتا ہے۔ اور یہ کوئی مفروضہ، واہمہ یا تخیل کی کرشمہ آرائی نہیں، بلکہ وہ حقیقت ہے جسے خود مولانا اصلاحی تسلیم بلکہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقدمہ تفسیر تدبر قرآن میں منکرین حدیث کے رویے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم وصلوٰۃ، حج وزکوٰۃ، اور عمرہ وقربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور امت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک نقل کی ہے، اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم وتغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے''۔ (تدبر قرآن ا/۲۹)'' (محدث ۳۳)

گویا پہلے مولانا اصلاحی پر انکارِ حدیث کا بے بنیاد مقدمہ قائم کیا اور پھر ان کی منکرین حدیث کا قلع قمع کرنے والی تیغ بے نیام کو اٹھایا اور انہی پر وار کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ روشنی کے اثبات کے لیے رات کی مثال دی جائے اور ذائقہ شیریں کی وضاحت کے لیے حنظل کا حوالہ دیا جائے۔ یہ طرز استدلال کا ایک نیا اسلوب ہے۔ اس کے سامنے آجانے کے بعد اب یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ مقدمہ قائم کرے کہ اہل محدث رجم کی روایات کا انکار کرتے ہیں اور اس کی دلیل کے طور پر جناب حافظ صلاح الدین صاحب یوسف کی کتاب ''حد رجم کی شرعی حیثیت'' کو پیش کردے۔

آخر میں ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ جس طرح اہل محدث نے مولانا اصلاحی کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر غلط معنی دیے ہیں، اسی طرح کوئی علم واخلاق سے بے بہرہ شخص ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرسکتا ہے۔ اس معروضے کے لیے یہ ایک مثال ہی کافی ہے۔

اہل محدث لکھتے ہیں:

> '' (مبادی تدبر حدیث میں) نئے اصول وضع کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے تاکہ محدثین کی بے مثال کاوشوں پر پانی پھیر دیا جائے اور لوگوں کو ایسے ہتھیار فراہم کردیے جائیں جنہیں استعمال کرکے وہ جس حدیث کو چاہیں رد کردیں اور جس ضعیف اور باطل حدیث کو چاہیں، صحیح قرار دے لیں''۔ (محدث ۳۳)

اس اقتباس سے یہ بات پوری طرح مبرہن ہے کہ اہل محدث کے نزدیک احادیث ''ضعیف اور باطل'' بھی ہوتی ہیں۔ کیا اس بات کو بنیاد بنا کر کوئی شخص ان کے خلاف حدیث کے انکار اور ابطال کا مقدمہ نہیں قائم کرسکتا؟

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

مولف:۔ امام حمید الدین فراہی — ترجمہ وترتیب :۔ خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف:۔ مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب :۔ عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق وباطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- معرفت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قیمت -/34 روپے

اسباق النحو

مصنف:۔ خالد مسعود

- امام فراہی کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

قیمت -/36 روپے

''میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لئے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی''۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن وحدیث۔ رحمان سٹریٹ 'مسلم کالونی' سمن آباد' لاہور۔
2- دارالتذکیر۔ رحمان مارکیٹ 'غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔